ماہنامہ
جہدِ حق

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

Registered No. CPL-13

جلد نمبر 35 ... شمارہ نمبر 02 ... فروری 2026

خواتین کی جدوجہد پرواز میں بدلتی ہوئی

☆انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے واقعات کی رپورٹ

1-وقوعہ کیا تھا:							
2-وقوعہ کب ہوا؟	سال			مہینہ		تاریخ	
3-وقوعہ کہاں ہوا؟	گاؤں				محلّہ		
	ڈاک خانہ				تحصیل وضلع		
4- کیا وقوعہ کا مقامی رسم ورواج سے تعلق ہے	ہاں				نہیں		
5-وقوعہ کیسے ہوا؟ (مختصر تفصیل)							
6-وقوعہ کا ماضی کے کسی دوسرے واقعہ سے تعلق اور اس کی مختصر تفصیل							

7-وقوعہ کا شکار ہونے والے کے کوائف	نام	ولد/زوجہ	پیشہ

8-وقوعہ سے متاثر ہونے والے کے معاشی/سماجی حیثیت	بچہ/بچی	عورت/مرد	غریب/ان پڑھ	بوڑھا/بوڑھی	بیمار	
	مخالف سیاسی کارکن	سماجی کارکن	اقلیتی فرقے کا رکن	دیگر (تخصیص کریں)		

9-وقوعہ میں ملوث اشخاص کے کوائف:	نام	ولدیت/زوجیت	عہدہ	پیشہ
	-1			
	-2			
	-3			

10-وقوعہ کے ذمہ دار فرد/افراد کی معاشی/سماجی حیثیت	بڑا جاگیردار/زمیندار/بہت امیر آدمی	متوسط طبقے سے/غریب آدمی	بااثر صلاحیت/سیاسی اثر ورسوخ	

11-وقوعہ کی پشت پناہی کرنے والے عناصر کے کوائف	نام اور ولدیت	عہدہ	پیشہ	پارٹی/ادارہ
	-1			
	-2			
	-3			

12-وقوعہ سے متعلقہ فریقین گواہان وغیر جانبدار افراد کے کوائف وموقف

وقوعہ سے تعلق	نام اور ولدیت	وقوعہ سے متاثر ہونے والے کے ساتھ تعلق/رشتہ داری	عہدہ	موقف
واقعہ سے متاثر				
واقعہ کا ذمہ دار				
چشم دید گواہ				
غیر جانبدار/پڑوسی				

13-اس قسم کے واقعات علاقہ میں کس قدر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں	بہت زیادہ	اکثر اوقات	کبھی کبھار	کبھی نہیں
14-اس قسم کے واقعات اندازاً کتنی تعداد میں ہوتے ہیں	روزانہ	ماہانہ	سالانہ	

15-وقوعہ کے بارے میں HRCP نامہ نگار/اس کے ساتھ چھان بین کرنے والے/والوں کی رائے

رپورٹ بھیجنے والے کے کوائف:	نام	پتہ: گاؤں/محلّہ	شہر/ضلع

انسانی حقوق کے عالمی منشور کی کس شق کی خلاف ورزی ہوئی؟

دستخط: .....

تاریخ: .....

نوٹ: اگر تفصیلات فارم پر نہ آ سکیں تو نمبر لکھ کر سادے کاغذ پر تفصیل درج کریں

☆تمام ساتھی جو انسانی حقوق کے حوالے سے رپورٹیں بھیجتے ہیں آئندہ اس فارم کی فوٹو کاپی پر کوائف لکھ کر بھیجیں

فہرست

پریس ریلیز 03

ماما قدیر بلوچ: بلوچستان کے لاپتہ افراد کی آواز، جن کی جنیوا تک لانگ مارچ کی خواہش پوری نہ ہو سکی 04

درختوں کا قتلِ عام 05

بلوچستان میں 10 لاشوں کی برآمدگی کا معمہ: 'ہم پر غم کے پہاڑ گرا دیے گئے' 06

اوسط آمدنی میں اضافے کے باوجود پاکستانی پہلے سے زیادہ غریب کیوں ہو گئے؟ 08

پاکستان میں خواتین: مزاحمت، اصلاحات اور مساوات کے نئے مطالبات کا سال 09

پاکستانی خواتین کے لیے زیادہ روزگار شہروں میں یا دیہات میں؟ 10

آفت زدہ قرار دیے جانے کے بعد متاثرہ علاقہ کے کیا کیا حقوق ہوتے ہیں؟ 11

تھرپارکر کے ہاریوں کی صدا 12

پاکستان میں اقلیتوں کی جدوجہد: مشکلات اور سفارشات 13

پاکستان میں خواتین کے ساتھ زیادتی 14

تعلیم، جینڈر اور انسانی وقار: ایک تھکی ہوئی شناخت کی جدوجہد 15

سال 2025: تنازعات و بحرانوں کی وجہ سے نظام ہائے صحت دباؤ میں رہے 16

جلاوطنی میں خون کا بہاؤ 17

ایچ آر سی پی کے اجلاس میں اظہارِ رائے پر پابندیوں کے خلاف اجتماعی مزاحمت کی اپیل

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کے زیرِ اہتمام ایک راؤنڈ ٹیبل اجلاس میں شرکاء کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، جہاں مقررین نے الیکٹرانک جرائم کی روک تھام کا ایکٹ 2016 (پیکا) اور اس میں کی گئی ترامیم کے عام شہریوں پر منفی اثرات کو دہرایا اور ڈیجیٹل اظہارِ رائے کی آزادی کے تحفظ کے لیے مشترکہ جدوجہد پر زور دیا۔

اجلاس کی نظامت وکیل ازور شکیل نے کی۔ یہ راؤنڈ ٹیبل ایچ آر سی پی کی جاری مہم ''پیکا کے دس سال، خاموشی کے دس سال'' کے تحت منعقد ہوا۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (پی ایف یو جے) کے صدر افضل بٹ نے ایسے قوانین کی اصولی مخالفت کی ضرورت پر دوبارہ زور دیا جو بنیادی حقوق کو محدود کرتے ہیں۔ انہوں نے مناسب کنٹرول اور جبر کے درمیان فرق واضح کرنے کے لیے حکام سے براہِ راست مکالمے کی بھی تجویز دی۔

سینئر صحافی اور ایچ آر سی پی کے کونسل ممبر ناصر زیدی نے کہا کہ ریاست کا اظہارِ رائے کے حوالے سے رویہ تاریخی طور پر پابندیوں پر مبنی رہا ہے، جہاں قوانین آئینی حقوق کے تحفظ کی بجائے بیانیے کو کنٹرول کرنے کے لیے بنائے گئے۔ کئی صحافیوں نے آزادیِ صحافت کو درپیش مسائل کی نشاندہی کی۔ صحافی اکبر نوتیزئی نے کہا کہ بلوچستان میں اخبارات کے ریاستی اشتہارات پر بڑھتے انحصار کے باعث ادارتی آزادی کو برقرار رکھنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ صحافی مطیع اللہ جان نے خبردار کیا کہ پیکا کے تحت ایف آئی اے کی تحقیقات میں دیگر سیکیورٹی اداروں کی شمولیت اختیارات کے ناجائز استعمال کا خطرہ بڑھا دیتی ہے۔

اجلاس کے دوران متعدد شرکا نے ہراسانی کے ذاتی تجربات بھی بیان کیے۔ ایک صحافی نے ایف آئی اے کے اہلکاروں کی جانب سے دھمکیوں کا ذکر کیا، جس سے قانون نافذ کرنے والے اداروں میں مبینہ بدعنوانی اور احتساب کے فقدان کی عکاسی ہوتی ہے۔

وکلا اور صحافیوں، جن میں ثاقب بشیر اور اسد طور شامل تھے، نے پیکا سے متعلق مقدمات میں مختلف عدالتوں میں مربوط اور شواہد پر مبنی قانونی چارہ جوئی کی اہمیت پر زور دیا، تاہم ان کا کہنا تھا کہ محض قانونی راستے کافی نہیں بلکہ شفاف عوامی بحث اور اجتماعی مزاحمت بھی ناگزیر ہے۔ سابق وزیرِاعظم شاہد خاقان عباسی نے بھی اس بات سے اتفاق کیا کہ آزادیِ صحافت کو محدود کرنے والے قوانین کے خلاف مزاحمت ضروری ہے۔

اجلاس کے اختتام پر سابق سینیٹر اور ایچ آر سی پی کے کونسل ممبر فرحت اللہ بابر نے پیکا قوانین کے تحت قانون کے معین ضابطے کی خلاف ورزیوں سے نمٹنے کے لیے بلا معاوضہ (pro bono) قانونی ٹیمیں تشکیل دینے اور اس معاملے پر سیاسی جماعتوں سے منظّم رابطے کی تجویز دی، جس کی راولپنڈی جرنلسٹس یونین کے صدر طارق علی نے تائید کی۔ فرحت اللہ بابر نے یہ بھی کہا کہ ان قوانین کے غلط استعمال کے ذمہ دار اہلکاروں کی اعلانیہ نشاندہی کی جانی چاہیے۔

[پریس ریلیز۔ اسلام آباد۔ 22 جنوری 2025]

ماما قدیر بلوچ: بلوچستان کے لاپتہ افراد کی آواز، جن کی جنیوا تک لانگ مارچ کی خواہش پوری نہ ہوسکی

بلوچستان کے لاپتہ افراد کی بازیابی کے لیے طویل عرصے سے جدوجہد کرنے والے ماما قدیر بلوچ سنیچر کے روز انتقال کر گئے ہیں۔ان کی عمر 85 برس تھی۔

وہ رواں سال عیدالفطر کے بعد سے بیمار تھے جبکہ چند روز سے وہ کوئٹہ کے ایک نجی ہسپتال میں وینٹی لیٹر پر تھے۔

ان کے بیٹے بجار ریکی نے بی بی سی کو ان کی موت کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ ماما قدیر کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین ان کے آبائی علاقے سوراب میں کی جائے گی۔

لاپتہ افراد کے رشتہ داروں کی تنظیم 'وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز' کے چیئرمین نصر اللہ بلوچ نے بتایا کہ قدیر بلوچ دمے کے عارضے میں مبتلا تھے جبکہ چند ہفتے قبل ان میں ٹی بی کی تشخیص کے علاوہ جگر میں مسئلے کی نشاندہی بھی ہوئی تھی۔

لاپتہ افراد کے رشتہ داروں کی تنظیم 'وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز' نے ماما قدیر کی موت پر تین روزہ سوگ کا اعلان کیا ہے اور اس دوران کوئٹہ میں احتجاجی بھوک ہڑتالی کیمپ بھی بند رہے گا۔ماما قدیر نے لاپتہ افراد کی بازیابی کے لیے پاکستان کی تاریخ میں طویل ترین لانگ مارچ بھی کیا تھا۔

ماما قدیر بلوچ کون تھے؟

ماما قدیر بلوچ کا تعلق بلوچستان کی قلات ڈویژن کے علاقے سوراب سے تھا۔وہ چھ جون 1940 کو سوراب میں پیدا ہوئے۔انھوں نے مڈل تک تعلیم سوراب سے حاصل کی جبکہ میٹرک خضدار شہر سے کرنے کے بعد انٹرمیڈیٹ کوئٹہ سے کیا۔وہ تعلیم کے دوران اور اس کے بعد قوم پرستی کی سیاست سے وابستہ رہے اور نیشنل عوامی پارٹی (این اے پی) کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔سنہ 1974 میں انھوں نے کیشیئر کے طور پر یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ میں ملازمت اختیار کی اور 2009 میں گریڈ تھری کے افسر کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ریٹائرمنٹ کے بعد عموماً لوگ آرام کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں لیکن ماما قدیر بلوچ کو آرام کا موقع نہیں ملا بلکہ ان کے حصے میں پہلے سے کئی گنا زیادہ مشکل کام آ گیا۔

ماما قدیر کے جوان بیٹے کی گمشدگی

ماما قدیر نے بیٹے کی لاش کی برآمدگی کے بعد احتجاجی کیمپ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔2009 میں ماما قدیر کے بڑے بیٹے جلیل ریکی کوئٹہ سے لاپتہ ہو گئے تھے۔ماما قدیر کا الزام تھا کہ ان کے بیٹے کو سکیورٹی فورسز کے اہلکار اٹھا کر لے گئے جس کے بعد ان کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ماما قدیر کے مطابق انھوں نے جلیل ریکی کو محنت سے پڑھایا۔ڈبل ایم اے کرنے کے بعد ان کا بیٹا یونائیٹڈ بینک میں افسر کے طور پر تین سال تک ملازم رہا۔بیٹے کی جبری گمشدگی کے ساتھ ہی 2009 سے ماما قدیر ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئے تھے جو پہلے ہی سے اپنے لاپتہ رشتہ داروں کی جبری گمشدگی کے خلاف وقتاً فوقتاً احتجاج کرتے رہتے تھے۔ماما قدیر نے ستمبر 2019 میں بی بی سی کو دیے جانے والے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ جلیل ریکی کو بڑھاپے میں ان کا سہارا بننا تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا کیونکہ جبری طور پر گمشدگی کے تین سال بعد ضلع کیچ سے ان کی تشدد زدہ لاش ملی۔

'ماما قدیر طویل علامتی بھوک ہڑتالی کیمپ کے روح رواں تھے'

وائس فار مسنگ بلوچ پرسنز کے چیئرمین نصر اللہ بلوچ نے بتایا کہ ان کی تنظیم کی جانب سے لاپتہ افراد کی بازیابی کے لیے قائم علامتی بھوک ہڑتال کیمپ جدید دنیا کا طویل ترین احتجاجی کیمپ ہے۔یہ کیمپ چھ ہزار 35 دن سے زائد کے عرصے سے قائم ہے۔نصر اللہ بلوچ نے بتایا کہ ماما قدیر ہی اس کیمپ کے روح رواں تھے۔ماما قدیر نے اپنے انٹرویو میں بتایا تھا کہ پہلے سیاسی جماعتیں بھی گمشدگیوں کے حوالے سے احتجاج کر رہی تھیں لیکن لاپتہ افراد کے لواحقین نے یہ سوچا کہ وہ خود کیوں نہ اس حوالے سے تنظیم بنائیں۔'لواحقین کا اجلاس ہوا جس کے بعد انھوں نے نصر اللہ بلوچ کی سربراہی میں اس تنظیم کے لیے وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کا نام تجویز کیا جس کے پلیٹ فارم سے باقاعدہ طور پر علامتی بھوک ہڑتال کا سلسلہ شروع کیا گیا۔'ماما قدیر بلوچ کو اس تنظیم کا وائس چیئرمین مقرر کیا گیا۔اگرچہ اس کیمپ میں تنظیم کے عہدیداروں کے علاوہ لواحقین بھی بھوک ہڑتال میں بیٹھتے رہے ہیں لیکن ماما قدیر 2009 سے مستقل طور پر اس میں بیٹھتے رہے۔جن لوگوں کے لاپتہ رشتہ داروں کی تشدد زدہ لاشیں برآمد ہوئیں یا ان کے پیارے بازیاب ہوئے تو ان میں سے زیادہ تر لاپتہ افراد کی بازیابی کے لیے احتجاجی کیمپ میں نظر نہیں آئے۔لیکن ماما قدیر نے بیٹے کی لاش کی برآمدگی کے بعد ایسا نہیں کیا بلکہ انھوں نے احتجاجی کیمپ کو اپنا اوڑھنا بچھونا ہی بنا دیا۔ان کا کہنا تھا کہ بیٹے کی جبری گمشدگی کے باعث جو دکھ ان کا تھا وہی دکھ ان سب کا ہے جن کے پیارے لاپتہ ہیں، اس لیے بیٹے کی لاش کی برآمدگی کے بعد انھوں نے جدوجہد کو ترک نہیں کیا۔کوئٹہ میں پریس کلب کے باہر لاپتہ افراد کی بازیابی کے لیے قائم بھوک ہڑتالی کیمپ کو چار مرتبہ نذرِ آتش کیا گیا۔ماما قدیر کا بی بی سی کو انٹرویو میں کہنا تھا کہ ان کا احتجاج پرامن تھا لیکن اس کے باوجود ان کے لیے مشکلات کھڑی کی گئیں۔ان کے مطابق انھیں مبینہ طور پر متعدد بار بالواسطہ اور بلاواسطہ کیمپ ختم کرنے کے لیے سنگین نتائج کی دھمکیاں دی گئیں۔ان کا کہنا تھا کہ کیمپ کو نذرِ آتش کرنے کے علاوہ اس میں گندگی بھی پھینکی جاتی رہی۔انھوں نے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ گھر کے قریب موٹر سائیکل سواروں نے ٹکر ماری جس سے وہ گر کر زخمی ہو گئے۔ماما قدیر بلوچ کا کہنا تھا کہ جو دکھ ان کا تھا وہی دکھ ان سب کا ہے جن کے پیارے لاپتہ ہیں، اس لیے بیٹے کی لاش کی برآمدگی کے بعد انھوں نے جدوجہد کو ترک نہیں کیا۔

پاکستان کی تاریخ کا طویل لانگ مارچ بھی کیا

ماما قدیر نے لاپتہ افراد کی بازیابی کے لیے طویل لانگ مارچ بھی کیا جس میں لاپتہ افراد کے دیگر رشتہ بھی شامل تھے۔

اس لانگ مارچ کا آغاز اکتوبر 2013 میں کوئٹہ سے کیا گیا۔لانگ مارچ کے شرکا پہلے پیدل کراچی پہنچے۔کراچی میں چند روز قیام کے بعد اسلام آباد کے لیے مارچ شروع کیا گیا۔ماما قدیر نے بتایا تھا کہ کوئٹہ سے براستہ کراچی اسلام آباد تک ان کو لگ بھگ چار مہینے لگے تھے۔'انھوں نے بتایا تھا کہ لانگ مارچ کے دوران بھی مختلف علاقوں میں ڈرانے اور دھمکانے کی کوشش کی گئی لیکن ہم نے اس کے باوجود لانگ مارچ کو جاری رکھا۔'

جنیوا تک لانگ مارچ کی خواہش پوری نہ ہوسکی

ماما قدیر بلوچ نے سنہ 2018 میں جنیوا کا دورہ بھی کیا اور جبری گمشدگیوں سے متعلق اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں کے اجلاسوں میں بھی شرکت کی۔اس کے علاوہ انھوں نے اس سلسلے میں امریکہ کا بھی دورہ کیا۔ماما قدیر کا کہنا تھا کہ امریکہ کے موجودہ صدر ٹرمپ کی پہلے صدارتی انتخابی مہم کے دوران وہ امریکہ تھے جہاں ان کی ٹرمپ سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔نصر اللہ بلوچ نے بتایا ماما قدیر بلوچ نے ایک ڈیڑھ سال قبل لاپتہ افراد کی بازیابی کے لیے جنیوا تک بھی لانگ مارچ کا اعلان کیا تھا۔ان کا کہنا تھا کہ وہ یہ لانگ مارچ نہیں کر سکے کیونکہ حکومت نے ان کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کیا تھا۔

درختوں کا قتلِ عام

ڈاکٹر حسین احمد پراچہ

گزشتہ کئی ہفتوں سے ایوانوں اور عدالتوں میں بڑے حزن و ملال کے ساتھ درختوں کے قتلِ عام کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ محض اسلام آباد میں گزشتہ چند مہینوں میں 29 ہزار سے زائد درخت کاٹے جا چکے ہیں۔ انگریزی کے ایک صاحبِ احساس رائٹر نے درست ہی لکھا تھا کہ: To cut a tree is to kill a tree۔

مجھے یاد آ رہا ہے کہ غالباً دو برس قبل خاکسار نے ایک سائنسی مضمون کے حوالے سے لکھا تھا کہ درخت اور پودے نہ صرف آپس میں گفتگو کرتے ہیں بلکہ وہ کبھی کبھی انسانوں سے بھی ہمکلام ہو جاتے ہیں۔ قتلِ عام میں بچ جانے والے اسلام آباد کے درخت آپس میں ان دنوں یہی گفتگو کرتے ہوں گے کہ اس ملک کے وزیر یا تدبیر کتنے دانشمند ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ہزاروں کی تعداد میں درخت کاٹے ہیں تو اُن کی جگہ نئے بھی تو لگائے ہیں۔ انہیں کون سمجھائے کہ برسوں بلکہ دہائیوں سے پابہ گل اور سر بفلک فضاؤں میں جھومتے درختوں کو کاٹ دینے اور انکی جگہ پنیری لگا دینے میں کیا فرق ہے۔ آج سے 15 برس قبل اسلام آباد میں اپنے چھ سالہ قیام کے دوران شکر پڑیاں کے پہلو سے جنگل کے بیچوں بیچ گزرتی سڑک اور انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اور فیصل مسجد کے گرداگرد مارگلہ کی سبز پوش پہاڑیاں اور ان پر جھومتے مہکتے اشجار میری پسندیدہ جگہیں تھیں۔

درختوں کا نوحہ لکھنے سے پہلے میں نے ضروری سمجھا کہ آج کے اسلام آباد کے حوالے سے ثقہ ذرائع سے معلومات حاصل کی جائیں۔ برسوں سے اسلام آباد میں مقیم ایڈووکیٹ آصف محمود صاحب میرے عزیز دوست ہیں۔ وہ جنگلوں کے دلدادہ اور وہاں سیر و سیاحت کے شوقین ہیں۔ ان کی فراہم کردہ معلومات چشم دید ہی نہیں چشم کشا بھی ہیں۔ اسلام آباد میں تین نیشنل پارک ہیں۔ ان پارکوں یا جنگلوں میں کسی قسم کی کوئی تعمیرات قانوناً نہیں کی جا سکتیں (اگرچہ یہاں قانون موم کی ناک ہے)۔ ان پارکوں کا آئیڈیا یہ تھا کہ یہاں کے پُر بہار درخت، ان پر چہچہاتے رنگ برنگ پرندے، نیچے مخملیں گھاس یہاں کے باسیوں کو ایک خوش نما اور خوشگوار ماحول فراہم کریں گے جو شہریوں کی بہترین جسمانی صحت اور ذہنی سکون کا باعث ہوگا۔

ان تین نیشنل پارکوں میں سے ایک شکر پڑیاں ہے۔ کچھ مدت پہلے سپریم کورٹ نے ضرور یہ حکم دیا تھا کہ یہاں لگائے گئے غیر ملکی جنگلی شہتوت کے درخت انسانوں کیلئے مضرِ صحت ہیں۔ ان سے دمہ، کھانسی اور کئی اقسام کی الرجی ہوتی ہے، اس لیے انہیں آہستہ آہستہ کاٹ دیا جائے اور ان کی جگہ انسان دوست اور ماحول دوست دیسی درخت بتدریج لگائے جائیں۔ شہری انتظامیہ کچھ عرصے سے یہ سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھی مگر 2025ء میں درختوں کے جنگل کے بجائے شکر پڑیاں میں کنکریٹ کا جنگل آباد کرنے کا درپردہ منصوبہ بنا لیا گیا۔ اگر صرف جنگلی شہتوت کے درختوں کی کٹائی مقصود ہوتی تو ان کی نشاندہی کی جاتی، شہری انتظامیہ کی طرف سے صرف انہی درختوں کی کٹائی کے احکامات جاری کیے جاتے مگر مخصوص منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کیلئے تیشے دے کر ٹھیکیداروں کو شکر پڑیاں کے جنگل میں بھیج دیا گیا۔ یہاں صرف شہتوت ہی نہیں بلکہ زمانوں سے موجود بڑے بڑے دیسی درختوں کے سینے بھی آروں سے چیر دیے گئے۔ ان درختوں کی جگہ قانون کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے ہوٹل کھل چکے ہیں، ایک ہاؤنگ کالونی بھی بن چکی ہے۔ اشرافیہ کے کلبوں کو زمین بھی الاٹ ہو چکی ہے اور یہاں جنگل کے بیچوں بیچ گزرنے والی ٹریل کو بھی بند کر دیا گیا ہے۔ درختوں کی اس کٹائی پر بڑی حیران کن اور اذیت ناک صورتحال ہے۔ ایک طرف ماحولیات کو آسودہ اور فرحت بخش بنانے اور موسمیاتی شدت کو کم کرنے کیلئے شجر کاری کیلئے پروگرام بنائے جا رہے ہیں اور دوسری طرف دھوپ کی تمازت جھیلتے اور ٹھنڈی چھاؤں چھڑکتے سرسبز و شاداب جنگلوں کو بھورے رنگ کے بنجر میدانوں میں بدلا جا رہا ہے۔

درختوں کی اس کٹائی کے خلاف انسانی حقوق کی ایک تنظیم کی طرف سے حال ہی میں اسلام آباد ہائی کورٹ میں درخواست دائر کی گئی ہے۔ درخواست میں کہا گیا ہے کہ مجموعی طور پر گزشتہ چند ماہ کے دوران اسلام آباد میں تقریباً 29 ہزار درخت کاٹے جا چکے ہیں۔ صرف شکر پڑیاں میں 8700 درخت کاٹے گئے ہیں۔ اس طرح اسلام آباد کے شہریوں کو صاف اور صحتمند ہوا اور فضا سے محروم کر کے ان کے بنیادی حقوق پامال کیے گئے ہیں۔ شہری انتظامیہ کا کہنا ہے کہ سپریم کورٹ کے احکامات کے تحت صرف جنگلی شہتوت کے درخت کاٹے گئے ہیں جبکہ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ ایسا نہیں بلکہ برسوں پرانے دیسی درخت بھی بڑی تعداد میں کاٹے گئے ہیں۔ اسلام آباد ہائی کورٹ میں دائر درخواست میں مزید کہا گیا ہے کہ صرف یہاں ہی نہیں بلکہ ایف نائن پارک میں بھی بہت سے درخت کاٹے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ایچ ایٹ، ایچ نائن اور چک شہزاد میں بھی درختوں کے مقتل بنا دیے گئے ہیں۔ شکر پڑیاں کے علاوہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اور فیصل مسجد کے گرداگرد مارگلہ کی سرسبز و شاداب پہاڑیوں اور ان پر اُگے ہوئے جنگلات کا میلوں تک پھیلا ہوا علاقہ بھی نیشنل پارک ہے۔ اسی طرح راول ڈیم کے اردگرد بھی جنگلات کا علاقہ ہے جہاں کسی طرح کی کوئی تعمیرات نہیں کی جا سکتیں۔ اسلام آباد خوبصورت ترین دارالحکومتوں میں شمار ہوتا تھا، اس کے حسن اور یہاں کے پُر فضا ماحول میں درختوں کا ہی بنیادی کردار تھا۔ اگر ان اشجار کو چھوٹی چھوٹی مفتوں کی خاطر زمیں بوس کر دیا جائے گا تو اسلام آباد کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور دھواں اڑاتی گاڑیوں کی کثرت کے بعد یہاں کا حسن ماند پڑ جائے گا۔

دوسری جانب لاہور ہائی کورٹ نے محکمہ تحفظِ اشجار کے چار افسران کے خلاف ایکشن لیا ہے کیونکہ لاہور کی خوبصورت ماحول دوست نہر کنارے کئی درخت کاٹے گئے تھے۔ اسی طرح زمانوں سے مال روڈ پر پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس اور گورنمنٹ کالج کے قرب و جوار میں واقع ناصر باغ، جسے پہلے گول باغ کہا جاتا تھا، میں دہائیوں پرانے، اپنی شان دکھاتے ہوئے ماحول دوست درختوں کو کاٹنا گویا شہر کو اس کے پھیپھڑوں اور تازہ آکسیجن سے محروم کرنا ہے۔ اس باغ سے نومبر 2025ء میں 123 درخت کاٹ دیے گئے۔ لاہور ہائیکورٹ نے اس واردات کی انکوائری کا حکم دیا ہے۔ لاہور ہائی کورٹ نے محکمہ تحفظِ اشجار کو حکم دیا ہے کہ آئندہ کوئی درخت بلکہ درختوں کی شاخیں تک نہ کاٹی جائیں۔ لاہور میں کئی برس قبل کینال روڈ کی توسیع کیلئے بہت سے پرانے درخت کاٹے گئے تھے۔ لاہور ہو یا اسلام آباد جب اس طرح درخت کاٹے جاتے ہیں تو مجید امجد کی نظم "توسیع شہر" یاد آتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے: بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار جھومتے کھیتوں کی سرحد پر بانکے پہرے دار گھنے سہانے چھاؤں چھڑکتے بُور لدے چھتنار بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار کٹتے ہیکل جھڑتے پنجر چھٹتے برگ و بار سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک اے آدم کی آل عربی زبان میں ایک اصطلاح "مصلحہ عامہ" کے نام سے رائج ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی غیر مرغوب قدم بھی عوامی فائدے کیلئے اٹھانا پڑ جاتا ہے۔ بلاشبہ عامۃ الناس کے فائدے کیلئے توسیع شہر یا عوام کی صحت کیلئے درخت کاٹنے بھی پڑ جاتے ہیں مگر چند خواص کے فائدے کیلئے درختوں کا قتلِ عام ایک قومی جرم سے کم نہیں۔

(بشکریہ روزنامہ دنیا)

بلوچستان میں 10 لاشوں کی برآمدگی کا معمہ: 'ہم پرغم کے پہاڑ گرا دیے گئے'

بلوچستان میں 2026 کے پہلے ہفتے کے دوران تین مختلف علاقوں سے جن 10 افراد کی لاشیں برآمد ہوئیں ان میں ایک سکول ٹیچر ایاز بلوچ تھے۔ ان کے ایک قریبی دوست نے بی بی سی کو بتایا کہ ایاز نے مشکلات کے باوجود اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی لیکن وہ گذشتہ برس لاپتہ ہو گئے تھے۔

جن دیگر تین افراد کی لاشیں برآمد ہوئی ہیں وہ آپس میں کزنز تھے۔ ان کے ایک قریبی رشتہ دار نے بتایا کہ وہ سات ماہ سے زیادہ عرصے سے 'جبری طور پر لاپتہ' تھے۔

ادھر بلوچستان کے حکام نے سکیورٹی اداروں کی طرف سے لوگوں کو جبری گمشدگی اور ماورائے عدالت قتل کے الزامات کو سختی سے مسترد کیا ہے۔ بلوچستان اسمبلی کے حکومتی رکن فرح عظیم شاہ نے ان الزامات کو 'بے بنیاد' قرار دیا ہے۔

تاہم بلوچستان سے لاپتہ افراد کے رشتہ داروں کی تنظیم وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے چیئرمین نصراللہ بلوچ کا کہنا ہے کہ ایاز بلوچ کو بھی پہلے ہی جبری طور پر لاپتہ کیا گیا تھا جبکہ بلوچ یکجہتی کمیٹی کے ایک بیان میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ایاز بلوچ کو مبینہ طور پر سکیورٹی فورسز نے لاپتہ کیا تھا۔

نصراللہ بلوچ کے مطابق ایاز بلوچ کے علاوہ مارے جانے والے ان افراد میں سے بعض دیگر بھی پہلے سے جبری طور پر لاپتہ تھے۔

دوسری طرف ضلع آواران میں پولیس کے حکام نے بتایا کہ ایاز بلوچ سمیت دو افراد کی لاشوں کی برآمدگی کے بارے میں تحقیقات ہو رہی ہیں۔

ایاز بلوچ سمیت دو افراد کی لاشیں چھ جنوری کو ضلع آواران میں جھاؤ کے علاقے موندرہ میں کورک ندی سے ملی تھیں۔ دوسرے شخص کی شناخت ظریف بلوچ کے نام سے ہوئی۔

آواران پولیس کے ایک اہلکار نے دونوں افراد کی لاشوں کی برآمدگی کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ ان کو 'نامعلوم افراد نے ہلاک کرنے' کے بعد ان کی لاشیں 'پھینک دی تھیں'۔

بی بی سی اردو نے ایاز بلوچ کے قریبی رشتہ داروں سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے کوئی بات کرنے سے گریز کیا تاہم ان کے ایک دوست نے بتایا کہ ایاز کو 16 اکتوبر 2025 کو آواران ہی کے علاقے گیشکور سے جبری طور پر لاپتہ کیا گیا۔

ان کا کہنا تھا کہ ایاز سے پہلے ان کے چچا ماسٹر خدا بخش کو بھی جبری طور پر لاپتہ کیا گیا تھا۔ ان کے مطابق لاپتہ ہونے

بلوچستان میں لاپتہ افراد کے لواحقین کا احتجاج

کے ایک ماہ بعد ایاز کے چچا کی تشدد زدہ لاش خضدار کے علاقے سے برآمد ہوئی تھی۔

اگرچہ ایاز کے چچا کی جبری گمشدگی کی آزادانہ طور پر تصدیق نہیں ہو سکی تاہم سماجی رابطوں کے پلیٹ فارمز پر بلوچ یکجہتی کمیٹی کی جانب سے جو بیان جاری کیا گیا اس میں الزام عائد کیا گیا کہ 16 اکتوبر 2025 کو ایاز بلوچ کو سکیورٹی فورسز نے گیشکور سے جبری طور پر لاپتہ کیا۔

اس سلسلے میں جب اس علاقے میں تعینات سکیورٹی فورسز سے متعلقہ ایک اہلکار سے رابطہ کیا گیا تو انھوں نے نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر اس الزام کو بے بنیاد قرار دیا۔

آواران پولیس کے ایس پی خلیل بگٹی نے بتایا کہ تاحال یہ تعین نہیں ہو سکا کہ ایاز اور ظریف کو کن لوگوں نے مارا اور انھیں کیوں مارا گیا؟

ان کا کہنا تھا کہ دونوں افراد کے مارے جانے کے واقعے کے بارے میں تحقیقات ہو رہی ہیں۔

ایاز بلوچ کون تھے؟

ایاز بلوچ کا تعلق ضلع آواران میں گیشکور کے علاقے سنڈوم سے تھا۔ انھوں نے مڈل تک تعلیم اپنے علاقے کے سکول سے جبکہ میٹرک کا امتحان گیشکور ہائی سکول سے پاس کیا۔

ان کے ایک دوست نے بتایا کہ آواران شہر میں ڈگری کالج سے ایف ایس سی کے بعد تنگ دستی کی وجہ سے کچھ عرصے کے لیے ان کو تعلیم ترک کر کے محنت مزدوری کرنا پڑی۔

انھوں نے بتایا چونکہ ایاز کو تعلیم کا بہت زیادہ شوق تھا اس لیے انھوں نے سنہ 2016 میں کوئٹہ میں ایک مرتبہ پھر انگلش لینگویج سینٹر میں داخلہ لیا۔ تربت یونیورسٹی میں بی ایس انگلش لٹریچر میں داخلہ ہونے کے باعث وہ بعد میں تربت منتقل ہوئے۔

تربت ہی میں گذشتہ عام انتخابات کے موقع پر بی بی سی کو دیے جانے والے ایک انٹرویو میں ایاز بلوچ نے بلوچستان میں تعلیم کے معیار پر عدم اطمینان کا اظہار کیا تھا جبکہ اس رائے کا بھی اظہار کیا تھا کہ بلوچستان میں انتخابات میں نمائندوں کو لوگ منتخب نہیں کرتے بلکہ ان کو 'لایا جاتا ہے'۔

ایاز بلوچ کے دوست نے مزید بتایا کہ محکمہ تعلیم میں اساتذہ کی آسامیوں کے لیے سردار بہادر خان وومن یونیورسٹی کے زیر اہتمام ٹیسٹ اور انٹرویوز ہوئے تو ایاز نے ان میں کامیابی حاصل کی جس کے باعث 2024 میں آواران میں رضائی بازار کے سکول میں ان کی بطور استاد تقرری ہوئی۔

انھوں نے بتایا کہ زمانہ طالب علمی میں اگرچہ ان کا تعلق بی ایس او ظریف گروپ سے رہا لیکن وہ سیاسی حوالے سے بہت زیادہ متحرک نہیں تھے۔

انھوں نے دعویٰ کیا کہ ان کو گیشکور سے مبینہ طور پر جبری طور پر لاپتہ کیا گیا۔

مارے جانے والے کزنز کے اہل خانہ: 'ہم پرغم کے پہاڑ گرا دیے گئے'

مارے جانے والے دس افراد میں سے چار کی لاشیں چار جنوری کو بلوچستان کے دو اضلاع ژوب اور موسیٰ خیل کی سرحدی علاقے سے ملی تھیں۔

اسسٹنٹ کمشنر موسیٰ خیل نجیب اللہ کاکڑ نے ان افراد کی لاشوں کی برآمدگی کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ چاروں افراد کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔

ان کا کہنا تھا کہ تاحال ان افراد کی ہلاکت کے محرکات معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ انتظامیہ کو ان افراد کی لاشوں کی ایک ویران علاقے میں پڑے رہنے کی اطلاع ملی تھی۔

ان افراد کی شناخت محمد انور، شیر محمد، جعفر اور ثنا اللہ کے ناموں سے ہوئی جن کا تعلق ضلع دُکی سے تھا۔ ان تمام افراد کا تعلق بلوچوں کے سمالانی قبیلے سے تھا۔

یہ رشتہ دار دُکی شہر سے اندازاً آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع 'کلی سفر علی بلوچ' کے رہائشی تھے جبکہ مارے جانے والے چوتھے شخص کا تعلق اس کے قریب والے گاؤں سے تھا۔

دُکی میں انتظامیہ کے ایک اہلکار نے نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بتایا کہ یہ چاروں افراد پہلے سے لاپتہ تھے۔

دُکی سے تعلق رکھنے چار افراد محمد انور، شیر محمد اور جعفر آپس میں کزنز تھے۔

ان کے ایک قریبی رشتہ دار نے بی بی سی کو بتایا کہ محمد انور کی عمر اندازاً 33 سال تھی جبکہ باقی دونو جوان تھے۔

ان کا کہنا تھا کہ یہ تینوں محنت مزدوری کرتے تھے۔ ان میں سے دو کاشتکاری کرتے تھے جبکہ ایک کوئلے کی کان میں مزدور تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ان میں سے ایک کو کوئلے کی لیز سے جبری طور پر لاپتہ کیا گیا جبکہ باقی دو کو دوسرے مقامات سے اٹھایا گیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ 'ہمارے خاندان پر غم نہیں بلکہ غم کے پہاڑ گرا دیے گئے۔'

انھوں نے بتایا کہ 'جب ہمارے لوگوں کو جبری طور پر لاپتہ کیا گیا تو ہم نے مقامی حکام کو اس سے آگاہ کیا لیکن ان کی بازیابی ممکن نہیں ہوئی۔' ان کا کہنا تھا کہ 'یہ ہمارے ساتھ ظلم کا پہلا واقعہ نہیں ہے بلکہ گذشتہ برس بھی ہمارے تین لوگوں کو جبری طور پر لاپتہ کرنے کے بعد مار دیا گیا تھا۔'

انھوں نے بتایا کہ 'ہمارے آٹھ مزید لوگ بھی جبری طور پر لاپتہ ہیں۔ بس ہم دعا کر سکتے ہیں کہ خدا ہمارے دیگر آٹھ افراد کو محفوظ رکھے اور ان کی بحفاظت بازیابی ہو۔'

باقی چار افراد لاشیں کہاں سے برآمد ہوئیں؟

باقی چار کی لاشیں دو جنوری کو ضلع ہرنائی میں زندہ پیر کے علاقے سے برآمد ہوئیں۔

ہرنائی میں پولیس کے ایک اہلکار نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ چاروں کو نامعلوم افراد نے فائرنگ کر کے ہلاک کیا تھا۔

ان افراد میں سے تین افراد کی شناخت ہوئی جن کا تعلق ہرنائی کے مختلف علاقوں سے تھا۔

نصر اللہ بلوچ نے بتایا کہ ہرنائی سے جن افراد کی لاشیں ملی تھیں ان میں سے ایک جمعہ خان مری تھے جنھیں پہلے ہی جبری طور پر لاپتہ کیا گیا تھا اور ان کا نام ہماری تنظیم کے لاپتہ افراد کی فہرست میں شامل تھا۔'

انھوں نے کہا کہ 'جمعہ خان مری کے رشتہ داروں نے بتایا کہ ان کو گذشتہ سال مبینہ طور پر سکیورٹی فورسز کے اہلکاروں نے ایک آپریشن کے دوران گھر سے اٹھایا تھا۔'

نصر اللہ بلوچ کے مطابق 'ہرنائی سے ان چار افراد میں سے ایک اور شخص کے رشتہ داروں نے تنظیم سے رابطہ کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ ان کو بھی پہلے ہی لاپتہ کیا گیا تھا لیکن ان کا نام ہماری تنظیم کے پاس رجسٹرڈ نہیں تھا۔'

نصر اللہ بلوچ نے بتایا کہ 'نہ صرف رواں برس تشدد زدہ لاشوں کی برآمدگی کا سلسلہ جاری ہے بلکہ گذشتہ سال بھی ان کی تنظیم کے ریکارڈ کے مطابق 185 ایسے افراد کی لاشیں برآمد ہوئی تھیں جن کو پہلے ہی جبری طور پر لاپتہ کیا گیا تھا۔'

'مقصد لوگوں کو خوفزدہ کرنا ہے'

پاکستان میں سکیورٹی امور کے ماہر اور پاکستان انسٹیٹیوٹ آف پیس سٹڈیز کے سربراہ محمد عامر رانا کا کہنا ہے کہ انھیں اس بات کا علم نہیں کہ تشدد زدہ لاشیں پھینکنے کا کام کون کر رہا ہے لیکن بعض حلقوں اور لواحقین کی جانب سے ریاستی اداروں پر الزام عائد کیا جا رہا ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ اگر واقعی یہ الزام درست ہے تو اس کا مقصد خوف پیدا کرنا ہو سکتا ہے اور ایسا کرنے والے شاید یہ چاہتے ہیں کہ لوگ شورش اور عسکریت پسندی سے دور رہیں اور اس کا حصہ نہ بنیں۔

اس سوال پر کیا اس طرح سے شورش کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے تو ان کا کہنا تھا کہ 'بظاہر تو اس طرح کی کارروائیوں کا مقصد خوف و ہراس پیدا کرنا ہوتا ہے لیکن ان کی رائے کے مطابق یہ طویل مدت تک فائدہ مند نہیں ہو سکتا ہے۔'

بلوچستان میں حالات کی بہتری سے متعلق سوال پر محمد عامر رانا کا کہنا تھا کہ بہتری کی صورت تو مذاکرات ہی ہیں لیکن فی الحال یہ ہوتے ہوئے دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔

بلوچستان حکومت کے ایک سینیئر عہدیدار نے نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر ان دس افراد کی لاشوں کی برآمدگی حوالے سے واٹس ایپ پر پیغام کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ لاپتہ افراد کے حوالے سے جج کی سربراہی میں ایک آزاد کمیشن قائم کیا گیا ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ اس حوالے سے کسی معلومات کے حصول کے لیے اس کمیشن سے رجوع کیا جائے۔ سی ٹی ڈی یعنی کاؤنٹر ٹیررزم ڈیپارٹمنٹ کے ایک سینیئر آفیسر نے ان دس افراد کی لاشوں کی برآمدگی کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔

تاہم اس سے قبل وزیر اعلیٰ بلوچستان میر سرفراز بگٹی نے صوبے میں لاشوں کی برآمدگی کے معاملے پر بی بی سی کو ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ 'اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ دہشت گرد جن کا نام لاپتہ افراد کی فہرست میں ہوتا ہے وہ کارروائیوں میں یا خودکش حملوں میں مارے جاتے ہیں تو پھر پتہ چلتا ہے کہ یہ نام لاپتہ افراد میں بھی شامل ہیں۔'

ان کا کہنا تھا کہ 'اکثر خاندانوں کو بھی پتہ نہیں ہوتا ہے کہ ان کا بچہ دہشت گرد گروہ میں شامل ہو چکا ہے۔'

وزیر اعلیٰ کا کہنا تھا کہ 'میری ان خاندانوں سے درخواست ہے کہ جن کے بچے عسکریت پسند گروہ میں شامل ہو چکے ہیں یا گھر سے دور ہیں، جن کے پاس ان کے بارے معلومات نہیں تو وہ حکومت اور علاقے کے عمائدین کے ساتھ اس کو شیئر کریں تاکہ کل وہ کسی دہشت گردی کی سرگرمی میں مارا جائے تو خاندان کو مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔'

بلوچستان اسمبلی میں حکومتی رکن اور حکومت بلوچستان کے سابق ترجمان فرح عظیم شاہ نے کہا کہ اس وقت ہمسایہ ممالک کی جانب سے ملک اور اس کے اداروں کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں جن کو لوگوں کو سمجھنا چاہیے۔

ان کا کہنا تھا کہ ملک دشمن قوتیں یہاں استحکام نہیں دیکھنا چاہتی اس لیے وہ ان اداروں کو بدنام کرنے کی سازش کرتی ہیں جو عدم استحکام پیدا کرنے کے منصوبوں کو ناکام بنا رہے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ 'ہمارے سکیورٹی سے متعلق ادارے آئین اور قانون کے دائرے میں رہ کر کام کرتے ہیں اور ان پر ماورائے آئین و قانون الزامات بے بنیاد ہیں۔'

اس سے قبل جبری گمشدگیوں اور تشدد زدہ لاشوں کی برآمدگی کے حوالے سے بی بی سی نے جب سکیورٹی فورسز کے ایک سینیئر اہلکار سے رابطہ کیا تھا تو ان کا کہنا تھا کہ لاپتہ افراد کا معاملہ بنیادی طور پر ایک سوچی سمجھی سازش ہے، جس کے تحت دشمن پاکستان کو بدنام کرنے اور عوام کو حکومتی اداروں کے خلاف کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اہلکار کا کہنا تھا کہ 'تحقیقات کے مطابق زیادہ تر افراد کو دہشت گرد تنظیمیں اغوا کر کے قتل کر دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگ دہشت گرد تنظیموں میں شامل ہو جاتے ہیں اور ان کے گھر والوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔'

'یہ سب کچھ پاکستان دشمن عناصر کی پشت پناہی میں کیا جاتا ہے۔'

انھوں نے کہا کہ 'پاکستان دشمن عناصر کالعدم تنظیموں کو استعمال کر کے لوگوں کو اغوا اور قتل کرواتے ہیں اور جب پاکستانی ایجنسیاں ایسے دہشت گرد گروہوں کے خلاف ایکشن لیتی ہیں تو ایک سوچی سمجھی چال کے مطابق الزام پاکستانی قانون نافذ کرنے والے اداروں پر لگایا جاتا ہے لیکن پاکستان جلد اپنے بہادر اور باشعور عوام کے ساتھ ایسی سازشوں کو ناکام بنائے گا۔'

(بشکریہ بی بی سی اردو)

اوسط آمدنی میں اضافے کے باوجود پاکستانی پہلے سے زیادہ غریب کیوں ہو گئے؟

یکم جنوری کو حکومت نے ہاؤس ہولڈ انٹیگریٹڈ اکنامک سروے 25-2024 کے نتائج 'Data-driven insights for inclusive growth' کے ذیلی عنوان کے تحت جاری کیے تاہم خود ایچ آئی ای ایس کے اعداد وشمار ظاہر کرتے ہیں کہ ہم جامع ترقی کی مخالف سمت میں بڑھ رہے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم اس بات کو سراہتے ہیں کہ ایچ آئی ای ایس 25-2024 مکمل کیا گیا اور تکنیکی اعتبار سے یہ بہتر انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ شماریاتی طور پر مضبوط اور نمائندہ سروے ہے کیونکہ اس میں ملک بھر کے 32 ہزار گھرانوں کو شامل کیا گیا ہے اور یہ شہری و دیہی پاکستان کے پانچ سماجی و معاشی درجوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ مزید یہ کہ یہ پہلا موقع ہے کہ ایچ آئی ای ایس ڈیجیٹل طریقے سے کیا گیا، پاکستان بیورو آف اسٹیٹکس تعریف کا مستحق ہے۔

سرکاری پریس ریلیز میں جن چھ نکات کو سنگِ میل کے طور پر پیش کیا گیا، وہ یہ ہیں: شرح خواندگی میں تین فیصد اضافہ، اسکول سے باہر بچوں میں دو فیصد کمی اور صاف ایندھن کے استعمال میں تین فیصد اضافہ۔ گھریلو سطح پر انٹرنیٹ تک رسائی 34 فیصد سے بڑھ کر 70 فیصد ہو گئی جبکہ انٹرنیٹ استعمال کرنے والے افراد کا تناسب 17 فیصد سے بڑھ کر 57 فیصد ہو گیا۔ یہ واقعی بہتر علامات ہیں۔

لیکن بچوں کی مکمل ویکسینیشن میں پانچ فیصد اضافہ ہو کر 68 فیصد سے 73 فیصد تک پہنچنا دراصل اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اب بھی 27 فیصد بچے مکمل طور پر حفاظتی ٹیکے نہیں لگوا سکے۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان بچوں کی اکثریت کہاں ہے، سابقہ فاٹا ایجنسیوں (اب اضلاع) میں 57 فیصد بچے اور بلوچستان میں تقریباً دو تہائی بچے مکمل طور پر ویکسین شدہ نہیں ہیں۔ یوں ایچ آئی ای ایس 25-2024 کے نمایاں نکات سطحی ہیں، اصل خطرات گہرائی میں موجود ہیں۔ تاہم ایچ آئی ای ایس واقعی ''حقیقی ڈیٹا کے ذریعے حقیقی زندگیوں کو محفوظ کرنے'' میں کامیاب رہا ہے۔

اس سروے کا ایک اہم انکشاف یہ ہے کہ 19-2018 سے 25-2024 کے درمیان پاکستان میں اوسط ماہانہ گھریلو آمدن 41 ہزار 545 روپے سے بڑھ کر 82 ہزار 179 روپے ہو گئی، یعنی 97.81 فیصد اضافہ۔

یہ سننے میں خوش آئند لگتا ہے کہ اوسطاً گھرانے اب زیادہ کما رہے ہیں۔ آمدن کی تقسیم کے لحاظ سے 25-2024 میں غریب ترین پانچواں حصہ اوسطاً 41 ہزار 851 روپے کماتا ہے جبکہ امیر ترین طبقہ 1 لاکھ 39 ہزار 317 روپے، یعنی تقریباً تین گنا زیادہ۔

شہری علاقوں میں عدم مساوات زیادہ نمایاں ہے جہاں امیر ترین گھرانے 1 لاکھ 46 ہزار 920 روپے سے بہت زیادہ کماتے ہیں جبکہ غریب ترین گھرانے 42 ہزار 412 روپے سے بھی کم پر گزارا کرتے ہیں۔

تاہم اسی عرصے میں اوسط گھریلو اخراجات میں 113 فیصد اضافہ ہوا۔ 19-2018 میں ایک اوسط گھرانہ ماہانہ 37 ہزار 159 روپے خرچ کرتا تھا جبکہ 25-2024 میں یہ خرچ بڑھ کر 79 ہزار 150 روپے ہو گیا۔ مجموعی طور پر 19-2018 کے مقابلے میں غریب ترین طبقے کے اخراجات میں 84 فیصد اضافہ ہوا جبکہ امیر ترین طبقے کے اخراجات میں 131 فیصد اضافہ ہوا جو امیر اور غریب کے درمیان بڑھتے ہوئے فرق کو ظاہر کرتا ہے۔

آمدن میں اس نام نہاد اضافے اور اخراجات میں اس سے کئی زیادہ اضافے کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ چھ برس میں ایک اوسط پاکستانی گھرانہ مزید غریب ہو گیا ہے اور زیادہ مشکل زندگی گزار رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کتنا زیادہ غریب؟

اصل کہانی حقیقی آمدن میں چھپی ہے، یعنی مہنگائی کے اثرات نکال کر 25-2024 کی آمدن کو 19-2018 کی قیمتوں میں دیکھنے سے، اس موازنے سے واضح ہوتا ہے کہ اوسطاً لوگ آج 19-2018 کے مقابلے میں زیادہ غریب ہیں۔ دیہی علاقوں کے امیر ترین 20 فیصد کو چھوڑ کر باقی تمام شہری اور دیہی طبقے غریب اور امیر حقیقی آمدن میں نقصان اٹھا چکے ہیں۔

سب سے زیادہ متاثر غریب شہری طبقہ ہے جس کی حقیقی آمدن میں 23 فیصد کمی آئی ہے۔ 19-2018 میں ایک غریب شہری گھرانہ اوسطاً 24 ہزار 365 روپے کماتا تھا جبکہ 25-2024 میں وہی گھرانہ 19-2018 کی قیمتوں کے مطابق صرف 18 ہزار 820 روپے کما رہا ہے۔ اس عرصے میں ایک اوسط شہری 19 فیصد اور ایک اوسط دیہی فرد 7 فیصد مزید غریب ہو گیا۔

اس سے بھی زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ یہ نسبتاً غربت حقیقی زندگیوں کو کیسے متاثر کر رہی ہے۔ گھریلو آمدن کا بڑا حصہ 36.72 فیصد بنیادی غذائی اشیا پر خرچ ہو رہا ہے، جو 19-2018 کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہے مگر اس کے باوجود لوگ چھ سال پہلے کے مقابلے میں کم خوراک استعمال کر رہے ہیں۔ ایچ آئی ای ایس 25-2024 کا ٹیبل 37-سی اس تلخ حقیقت کو واضح کرتا ہے۔

تقریباً تمام بنیادی غذائی اشیا کی فی کس کھپت میں کمی آئی ہے۔ مثال کے طور پر 19-2018 میں ایک اوسط شہری پاکستانی 6.12 کلو گرام گندم استعمال کرتا تھا جبکہ 25-2024 میں یہ مقدار کم ہو کر 5.67 کلو گرام رہ گئی۔ چاول، دالیں، دودھ، مٹن، بیف، چکن، انڈے، آلو، پیاز، چینی اور چائے سمیت تمام ضروری غذاؤں کی فی کس کھپت شہری اور دیہی دونوں علاقوں میں کم ہو گئی ہے۔ اس افسوسناک رجحان سے صرف ٹماٹر اور کوکنگ آئل مستثنیٰ ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ پاکستانی آج چھ سال پہلے کے مقابلے میں زیادہ خرچ کر رہے ہیں مگر کم کھا رہے ہیں۔ سروے کے مطابق غذائی عدم تحفظ کی شرح 19-2018 میں 15.9 فیصد سے بڑھ کر 25-2024 میں 24.4 فیصد ہو گئی ہے۔ تعلیم پر گھریلو اخراجات بھی کم ہو گئے ہیں۔ چھ سال پہلے تقریباً 4 فیصد خرچ تعلیم پر ہوتا تھا جو اب گھٹ کر تقریباً 2.5 فیصد رہ گیا ہے۔ صحت پر خرچ نسبتاً غیر لچکدار ہونے کے باعث معمولی سا بڑھ کر 3.22 فیصد سے 3.34 فیصد ہو گیا ہے۔

موجودہ حکومت کو اس افسوسناک صورتحال کی ذمہ داری اٹھانا ہو گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری معاشی بدحالی کی جڑیں اس استحصالی معاشی نظام میں ہیں جس پر ہم عمل پیرا ہیں، ہمارے مستقل گورننس کے مسائل اور تمام مسائل کی ماں ہماری دائمی طور پر غیر مستحکم سیاست ہے۔

پاکستان کو فوری طور پر مستقل اور پائیدار اصلاحات کی ضرورت ہے، جن کے لیے تمام فریقین کے درمیان قومی مکالمے کے ذریعے اتفاقِ رائے قائم کرنا ناگزیر ہے۔

ہمارے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کی سنگینی ایسی ہے کہ انہیں کسی ایک حکومت پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ تمام سیاسی جماعتوں اور ریاستی اداروں کو مل کر ایک طویل المدتی ترقیاتی منصوبہ بنانا ہو گا اور اسے کسی بھی حکومتی تبدیلی یا سیاسی ہلچل سے محفوظ بنانا ہو گا۔

جب تک ایسا نہیں ہوتا عوام کی مشکلات برقرار رہیں گی۔ قومی کامیابی کا پیمانہ یہ ہونا چاہیے کہ ایک غریب گھرانہ حقیقی معنوں میں کتنا خوشحال ہوتا ہے بجائے اس کے کہ ہم آئی ایم ایف سے قرض کی ایک اور قسط حاصل کرنے میں کتنے کامیاب ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ ڈان)

پاکستان میں خواتین: مزاحمت، اصلاحات اور مساوات کے نئے مطالبات کا سال

فروا نقوی

2025 میں خواتین کے مسائل کو پاکستان کے سماجی و سیاسی بیانیے میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ جب کہ قانونی اصلاحات اور نچلی سطح پر چلنے جانے والی مہموں نے پیش رفت کے آثار دکھائے، تاہم خواتین کو تشدد، محدود معاشی مواقع، اور سماجی رکاوٹوں کا بدستور سامنا رہا۔ سڑکوں پر، عدالتوں میں، اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر صنفی انصاف کے بارے میں بات چیت تیز تر ہوتی گئی۔

جی بی وی ایک قومی ایمرجنسی رہی

2024-2025 میں صنفی بنیاد پر تشدد (جی بی وی) کا دائرہ حیران کن حد تک وسیع رہا۔ سسٹین ایبل سوشل ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (ایس ایس ڈی او) کی 2024 کی رپورٹ کے مطابق، پاکستان بھر میں جی بی وی کے 32,617 کیسز رپورٹ ہوئے۔ ان میں جنسی تشدد کے 5,339 واقعات، اغوا کے 24,439، گھریلو تشدد کے 2,238، اور غیرت کے نام پر قتل کے 547 واقعات شامل تھے۔ ماہرین اور کارکنان کا مشاہدہ ہے کہ وسیع پیمانے پر کم رپورٹنگ اور سماجی بدنامی کے پیش نظر، اصل تعداد ممکنہ طور پر کافی زیادہ ہے۔ مقدمات کی زیادہ تعداد کے باوجود، سزا سنانے کی شرح خطرناک حد تک کم رہی۔ اسی ایس ایس ڈی او کی رپورٹ کے مطابق، قومی سطح پر سزا کی شرح جنسی تشدد اور غیرت کے نام پر قتل کے لیے تقریباً 0.5%، اغوا کے لیے 0.1%، اور گھریلو تشدد کے واقعات میں صرف 1.3% رہی۔ سوسائٹی آف اوبسٹیٹریشینز اینڈ گائنا کالوجسٹ پاکستان (ایس او جی پی) کے مطابق، جنس پر مبنی جرائم زچگی کی صحت پر براہ راست منفی اثرات مرتب کرتے ہیں، جس سے دوران زچگی ماؤں کی شرح اموات اور بیماری دونوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

قانونی اصلاحات اور عدالتی مداخلت

کاغذ کی حد تک، پاکستان نے خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لیے قانون سازی کی ہے۔ لیکن اس سال نے ایک اہم نکتہ پر روشنی ڈالی: قانون سازی نہیں بلکہ نفاذ کا غیر مؤثر ہونا اصل مسئلہ تھا۔ سول سوسائٹی کے مبصرین اور حقوق نسواں کے حامیوں نے دلیل دی کہ بہت سی خواتین اب بھی انصاف تک بامعنی رسائی سے محروم ہیں۔ عدالتی مداخلتوں اور مفاد عامہ کی قانونی چارہ جوئی نے کچھ امید پیدا کی، خاص طور پر بہت زیادہ تشہیر پانے والے کیسز میں۔ پھر بھی بہت سی متاثرین خاص طور پر پسماندہ کمیونٹیز سے، سماجی بدنامی، وسائل کی کمی، اور انتقامی کارروائی کے خوف جیسی رکاوٹوں کی وجہ سے انصاف تک رسائی نہیں رکھتیں۔

اقتصادی شراکت: سست لیکن نظر آنے والی پیش رفت اور مسلسل تفاوت

خواتین کی معاشی شراکت میں معمولی پیش رفت ہوئی لیکن ڈھانچہ جاتی نقائص اب بھی باقی ہیں۔ تازہ ترین پی بی ایس لیبر فورس سروے 2024-25 کے مطابق، افرادی قوت تقریباً 85.6 ملین افراد پر مشتمل ہے، جن میں سے صرف 19.9 ملین خواتین ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ خواتین افرادی قوت کی شرکت 2024-25 میں تقریباً 24.4 فیصد تک بڑھ گئی (پچھلے سالوں کی نسبت زیادہ)، جبکہ مردوں کی شرکت 69.8 فیصد رہی۔ ایک ہی وقت میں، خواتین بلا معاوضہ گھریلو مشقت اور نگہداشت کے کام کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہیں: سروے میں 2024-25 کے دوران ملک بھر میں گھریلو مشقت اور نگہداشت کا بلا معاوضہ کام کرنے والی 45.4 ملین خواتین کو شمار کیا گیا۔ اجرتوں کے بارے میں، آئی ایل او کی 2025 کے صنفی تنخواہ کے فرق کی رپورٹ نے انکشاف کیا ہے کہ پاکستان میں خواتین مردوں کے مقابلے میں نمایاں طور پر کم کماتی ہیں- تقریباً 25-30 فیصد کم، غیر رسمی شعبے میں یہ فرق کافی زیادہ (تقریباً فیصد) ہے۔

تعلیم اور ڈیجیٹل شمولیت: کچھ فوائد، لیکن غیر مساوی رسائی برقرار ہے

ڈبلیو ای ایف کی تازہ ترین گلوبل جینڈر گیپ رپورٹ 2025 کے مطابق، واحد ذیلی انڈیکس جہاں پاکستان میں معمولی بہتری دیکھنے میں آئی وہ 'تعلیم کا حصول' تھا: اس میدان میں برابری 1.5 فیصد پوائنٹس بڑھ کر 85.1 فیصد تک پہنچ گئی۔ یہ بہتری خواتین کی خواندگی میں معمولی اضافے کی وجہ سے ہوئی - 46.5 فیصد سے 48.5 فیصد تک - حالانکہ بظاہر نظر آنے والی بہتری کی جزوی وجہ مردوں کی ثانوی تعلیم کے اندراج میں کمی کی وجہ تھی۔ بہت سی لڑکیوں کو اب بھی اسکول چھوڑنے کے لیے غربت، غیر محفوظ انفراسٹرکچر، محفوظ نقل وحمل کی کمی، یا سماجی دباؤ جیسی رکاوٹوں کا سامنا ہے، خاص طور پر دیہی یا کم ترقی یافتہ علاقوں میں صحت، تولیدی حقوق اور سماجی بہبود: ملے جلے اشارے، بڑھتی ہوئی آگاہی صحت اور تولیدی حقوق کے اشارے ایک پیچیدہ تصویر دکھاتے ہیں۔ ایک طرف، خواتین کی تنظیموں اور کارکنوں نے زچگی کی صحت، ماہواری کی حفظان صحت سے متعلق آگاہی، خاندانی منصوبہ بندی، اور دماغی صحت کے بارے میں اپنی کوششیں بڑھادی ہیں- ان مسائل کو عوامی سطح پر مزید واضح کر دیا ہے۔ دوسری طرف، ادارہ جاتی کمی برقرار ہے: مثال کے طور پر، بہت سے اضلاع میں لیڈی ہیلتھ ورکرز کی نمایاں کمی، خاص طور پر دیہی علاقوں میں زچگی اور تولیدی صحت کی خدمات کو محدود کر رہی ہے۔ ثقافتی مزاحمت اور سماجی بدنامی، خاص طور پر دماغی صحت، تولیدی خودمختاری، اور صنفی بنیاد پر تشدد کے حوالے سے بڑی رکاوٹیں کھڑی کر رہی ہیں۔

سماجی تحریکیں اور عوامی آواز: عورتوں کی بلند آواز اور تبدیلی کا مطالبہ

2025 میں خواتین کے مسائل کے بارے میں عوامی تحریک میں اضافہ دیکھا گیا۔ خواتین کے مارچوں، کمیونٹی ریلیوں، اور ڈیجیٹل مہمات نے کام کی جگہ پر ہراسانی، گھریلو تشدد اور معاشی عدم تحفظ جیسے مسائل کو اجاگر کیا۔ سوشل میڈیا، خطرات کے باوجود، خواتین کے لیے بدسلوکی کو دستاویز کرنے، جوابدہی کا مطالبہ کرنے اور دیگر زندہ بچ جانے والی متاثرہ خواتین کے ساتھ یکجہتی پیدا کرنے کے لیے ایک طاقتور جگہ بن گیا۔

سیاسی شرکت اور نمائندگی: شمولیت کے مطالبات کے درمیان جمود

بڑھتی ہوئی سرگرمی اور عوامی موجودگی میں اضافے کے باوجود، خواتین کی رسمی سیاسی شرکت اور نمائندگی کم سے کم رہی۔ ڈبلیو ای ایف کی 2025 کی رپورٹ کے مطابق، سیاسی بااختیار بنانے کے ذیلی انڈیکس کے تحت، پاکستان کا سکور گرا: وزارتی کرداروں میں خواتین کا حصہ 2025 میں صفر تک گر گیا، حالانکہ پارلیمانی نمائندگی میں معمولی اضافہ ہوا تھا۔

انٹرسیکشنل اور ڈھانچہ جاتی مشکلات

اقلیتی مذہبی یا نسلی برادریوں سے تعلق رکھنے والی خواتین، ٹرانس جینڈر خواتین، معذوری کا شکار خواتین، اور وہ لوگ جو موسمیاتی آفات یا نقل مکانی سے متاثر ہوئی ہیں، مسلسل پیچیدہ اور ایک دوسرے سے جڑے خطرات کا سامنا کر رہی ہیں۔ ڈھانچہ جاتی عدم مساوات جو کہ غربت، سماجی اخراج، قانونی بیداری کی کمی اور ادارہ جاتی نظر اندازی میں پیوست ہیں، اکثر انہیں صنفی انصاف کے مرکزی دھارے کے مباحثے سے خارج رکھتے ہیں۔ بہت سے معاملات میں، امدادی نظام پسماندہ ہے: سماجی خدمات کی ایجنسیاں، محفوظ پناہ گاہیں، قانونی امداد کے نیٹ ورک، ذہنی صحت کی مدد- خاص طور پر پسماندہ خواتین کے لیے- ناکافی یا غیر مساوی طور پر تقسیم کیے گئے ہیں۔ حتمی طور پر، 2025 کا اختتام ایک نازک امید کے ساتھ ہوا: تعلیم میں معمولی بہتری آئی ہے، خواتین کی آوازوں کے اظہار میں اضافہ ہوا ہے، اور معاشی شراکت میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔ اس کے باوجود گہری ساختی عدم مساوات - اجرت کا فرق، کم روزگار، وسیع پیمانے پر صنفی بنیاد پر تشدد، قوانین کا غیر مؤثر نفاذ کی وجہ سے خواتین کی ترقی محدود رہی ہے۔ پچھلے سال کے اعداد و شمار (جی بی وی کے 32,000 سے زیادہ کیسز، لاکھوں بلا معاوضہ گھریلو مزدوری، 25 فیصد سے کم خواتین کی افرادی قوت میں شرکت، اور سزا کی شرح صفر کے قریب) ظاہر کرتی ہے کہ نظام میں تبدیلی اب بھی مبہم ہے۔ بامعنی تبدیلی کے لیے، پالیسی کے وعدوں کو جوابدہی، نفاذ، سماجی خدمات کی توسیع، اور سماجی تبدیلیوں کی حمایت ملنی چاہیے۔ آنے والا سال یہ جانچے گا کہ کیا تبدیلی کی یہ رفتار - کارکنوں، سول سوسائٹی اور عام شہریوں کی طرف سے- پاکستان بھر میں خواتین کے لیے مساوات، وقار اور انصاف میں حقیقی بہتری کی ترجمانی کر سکتی ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ دی نیشن)

پاکستانی خواتین کے لیے زیادہ روزگار شہروں میں یا دیہات میں؟

پاکستانی خواتین کے لیے روزگار کے زیادہ مواقع سے متعلق کوئی سوال ہو تو جواب کی تلاش میں ذہن عموماً شہری علاقوں کی طرف ہی جاتا ہے۔ مگر اعداد و شمار دراصل اس تاثر کی نفی کرتے ہیں۔

لیبر فورس سروے 2025 کے مطابق پاکستان میں برسرروزگار دیہی خواتین کا تناسب تقریباً 29 فیصد ہے جبکہ شہری خواتین میں یہی تناسب محض 12 فیصد ہے۔ اسی تناسب کا موازنہ اگر مردوں میں کیا جائے، تو دیہی اور شہری علاقوں کے مردوں کے برسرروزگار ہونے کی شرح میں خلیج محض پانچ فیصد بنتی ہے۔

بین الاقوامی سطح پر اربنائزیشن سے خواتین کی لیبر فورس میں عموماً اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن پاکستان میں صورتحال اس کے برعکس ہے۔

پاکستانی خواتین کی ملکی لیبر فورس میں صورت حال

پاکستانی دفتر شماریات کے تازہ ترین سروے کے مطابق خواتین کی قومی لیبر فورس میں مجموعی شرکت 22.7 فیصد ہے جبکہ مردوں میں یہ شرح 68.7 فیصد بنتی ہے۔ پاکستانی خواتین کی لیبر فورس میں بلند ترین شرح 2011 میں دیکھی گئی تھی، جو 24.4 فیصد رہی تھی۔

2008ء سے 2025ء کے درمیان خواتین کی افرادی قوت 20 فیصد سے 24 فیصد کے درمیان رہی، جسے ماہرین 'جمود' قرار دیتے ہیں۔ اس سروے کے علاوہ عالمی بینک کا پچھلی ایک دہائی کا ڈیٹا بھی اسی جمود کی تصدیق کرتا ہے، جس کے مطابق یہ تناسب مسلسل 20 اور 24 کے درمیان ہی کم یا زیادہ ہوتا رہا۔

پاکستان میں سرکاری ملازمتوں پر خواتین کی تعداد کم کیوں؟

پاکستان انسٹیٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس سے وابستہ اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر حنا احسن نے ڈی ڈبلیو اردو سے بات کرتے ہوئے کہا، ''1990 کی دہائی میں خواتین کا 13 فیصد سے شروع ہونے والا سفر بلندی کے بعد تنزلی کا شکار ہے۔ دستیاب ڈیٹا سے پتہ چلتا ہے کہ خواتین کی اقتصادی شرکت بڑھنے کے بجائے کم ہوئی ہے۔ گزشتہ 15 برس سے جمود طاری ہے۔"

وہ کہتی ہیں، ''لیبر فورس کا مطلب ہے کتنے افراد برسرروزگار ہیں یا پچھلے دو تین ہفتوں کے دوران کام کاج کی تلاش میں متحرک رہے ہیں۔ یہ معاشی سرگرمی کے علاوہ سماجی شرکت کو سمجھنے کا پیمانہ بھی ہے۔"

غذائی عدم توازن: پکاتی عورت ہے، مگر کھاتا کون ہے؟

شہری اور دیہی علاقوں کے اعتبار سے خواتین کی لیبر فورس میں اس تبدیلی کے حوالے سے وہ کہتی ہیں، ''لیبر فورس کا سب سے بڑا شعبہ زراعت ہے، جہاں خواتین کی شرکت 61 فیصد ہے، جو 24 فیصد مردوں کے مقابلے میں نمایاں طور پر زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیہی علاقوں میں خواتین کی ایک بڑی تعداد لیبر فورس کا حصہ بنتی ہے۔ اس کے برعکس شہری علاقوں میں روزگار کے دو بڑے شعبے سروسز اور انڈسٹری ہیں، جہاں خواتین کی شرکت نصف سے بھی کم ہے۔ اسی لیے شہری علاقوں میں برسرروزگار خواتین کی مجموعی شرح مردوں کے مقابلے میں خاصی کم رہتی ہے۔"

لیبر فورس میں خواتین کی شرکت میں اضافے کے بجائے کمی کیوں؟

تعلیم اور شرح خواندگی بڑھنے کے باوجود خواتین کی ملکی لیبر فورس میں شرکت بڑھنے کے بجائے کم کیوں ہو رہی ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ادارہ برائے ترقیاتی اقتصادیات کی ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر عظمیٰ ضیا نے ڈی ڈبلیو کو بتایا، ''رواں صدی کی پہلی دہائی میں معاشی طور پر فعال مردوں کی ایک بڑی تعداد زراعت سے وابستہ تھی۔ اس دوران صنعتی ترقی تیز ہوئی اور مردوں کی ایک بڑی تعداد کام کاج کے لیے شہروں کا رخ کرنے لگی۔ یوں مردوں کے دیگر شعبوں میں منتقل ہونے سے خواتین کے لیے زراعت میں روزگار کے مواقع پیدا ہوئے اور وہاں ان کی معاشی شرکت بڑھنے لگی۔"

روزگار کی منڈی اور معیشت سے متعلق اپنے ایک تحقیقی مضمون میں محقق فاروق ترمذی نے لکھا ہے، ''معیشت کی تیز رفتار ترقی نے بہتر تنخواہوں والی ملازمتیں پیدا کیں۔ مرد ان شعبوں میں گئے اور خواتین نے وہ کام سنبھال لیے، جو مرد چھوڑ گئے تھے۔"

فاروق ترمذی نے لکھا ہے کہ نئی ملازمتیں انڈسٹری اور سروسز میں تھیں اور ان شعبوں میں خواتین کی نسبت مردوں کے لیے زیادہ سازگار مواقع تھے، ''گزشتہ دہائی میں ایک کروڑ 34 لاکھ ملازمتیں پیدا ہوئیں، جو سب انڈسٹری اور سروسز کے شعبوں میں تھیں۔ ان میں سے محض 25 لاکھ ملازمتیں خواتین کو مل سکیں۔"

فاروق ترمذی کے مطابق، ''21 صدی کے آغاز پر خواتین کی ملکی لیبر فورس میں شمولیت اس لیے بڑھی کہ زراعت میں خواندگی کی کوئی شرط نہیں ہوتی۔ مگر اب نئی ملازمتیں صنعتوں اور خدمات کے شعبوں میں پیدا ہو رہی ہیں، جہاں کسی کارکن کی خواندگی اہم کردار ادا کرتی ہے۔" عظمیٰ ضیا اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہتی ہیں، ''گزشتہ ڈیڑھ عشرے کے دوران خواتین کی تعلیم اور ہنر میں غیر معمولی پیش رفت ہوئی۔ اس دوران اسکول جانے والی لڑکیاں آئندہ دو چار برس میں معاشی سرگرمیوں کا حصہ بنیں گی تو یہ جمود ٹوٹ جائے گا۔" ڈاکٹر حنا احسن کہتی ہیں، ''نقل و حرکت میں درپیش مشکلات اور دفاتر کے ماحول میں عدم تحفظ کے احساس کے باعث خواتین کے لیے فری لانسنگ ایک بڑی متبادل مارکیٹ کے طور پر ابھری ہے، جس میں نوجوان لڑکیاں خاصی دلچسپی لے رہی ہیں۔ اگرچہ حالیہ سروے میں فری لانسنگ کو شامل کیا گیا ہے، تاہم بظاہر یہ نتائج فری لانسنگ کے پورے دائرے اور اس کی حقیقی وسعت کی مکمل عکاسی نہیں کرتے۔"

شہری علاقوں میں خواتین لیبر فورس کے مسائل

پاکستان بزنس کونسل کے مرکز سی ای آر بی (Centre of Excellence in Responsible Business) کی سربراہ نازش شیخہ کے مطابق پاکستان میں خواتین کی لیبر فورس میں شرکت کو متاثر کرنے والے اہم عوامل تین ہیں۔ ان کا ڈی ڈبلیو سے گفتگو کرتے ہوئے کہنا تھا، ''پہلا، عوامی مقامات اور دفاتر میں تحفظ کے مسائل خواتین کو ملازمت اختیار کرنے یا جاری رکھنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ دوسرا، محفوظ اور سستی پبلک ٹرانسپورٹ کی کمی جو خواتین کی نقل و حرکت کو بہت مشکل بنا دیتی ہے۔ تیسرا، بچوں کی دیکھ بھال کے مناسب اور کم خرچ انتظامات کا فقدان، جو بہت سے خاندانوں کے لیے ایک بڑا مسئلہ ہے۔"

پاکستان میں سائیکل کا پہیہ دوبارہ چل پڑا

انہوں نے مثال دیتے ہوئے کہا، ''کچھ روز پہلے میں ملائیشیا میں تھی، وہاں رات دیر گئے خواتین دفاتر سے آ جا رہی تھیں۔ محفوظ اور سستی پبلک ٹرانسپورٹ میسر تھی۔ ایسے ماحول کی وجہ سے ملائیشیا میں خواتین کی لیبر فورس میں شرکت کا تناسب 55 فیصد سے بھی زیادہ بنتا ہے۔"

لیبر فورس میں خواتین کی شرکت میں اضافہ کیسے؟

ماہرین کے مطابق لیبر فورس میں خواتین کی شرکت بڑھانے کے لیے محض کوئی ایک پالیسی نہیں بلکہ باہم مربوط کئی متنوع سماجی، اقتصادی اور ادارہ جاتی اقدامات ضروری ہیں۔

پاکستانی خواتین کی کاروباری دنیا میں کامیاب سفر منفرد کہانیاں نازش شیخہ کے بقول، ''زچگی کی رخصت کے دوران اور اس کے بعد خواتین کو درپیش مشکلات اور دفاتر کے انتظامی مسائل اب بھی برقرار ہیں۔ ضروری ہے کہ دفاتر میں ایسا ماحول ہو، جہاں خواتین کو تعصب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ خواتین کو بہتر ٹرانسپورٹ دی جائے تاکہ انہیں آمد و رفت میں دشواری نہ ہو۔ بچوں کے لیے ڈے کیئر سینٹر بھی کافی ہوں اور اس سلسلے میں پاکستانی حکومت اپنا بھرپور کردار ادا کرے۔" ڈاکٹر حنا احسن کہتی ہیں، ''خواتین کو عموماً کم اجرت دی جاتی ہے، اور جب تک انہیں ان کی محنت کا معاوضہ مردوں کے مساوی نہیں ملے گا، خواتین کی اقتصادی شرکت محدود ہی رہے گی۔"

ادارت: مقبول ملک

(بشکریہ ڈی ڈبلیو)

آفت زدہ قرار دئے جانے کے بعد متاثرہ علاقہ کے کیا کیا حقوق ہوتے ہیں؟

چیپورسن جیسے سرد اور دشوار گزار علاقے میں یہ ذمہ داری مزید حساس اور فوری نوعیت اختیار کر لیتی ہے

اسرارالدین اسرار

جب ریاست کسی علاقے کو باضابطہ طور پر آفت زدہ قرار دیتی ہے تو یہ محض ایک سرکاری نوٹیفکیشن یا ہمدردی پر مبنی اعلان نہیں ہوتا، بلکہ یہ اعلان دراصل ریاست کی طرف سے اس حقیقت کا اعتراف ہوتا ہے کہ اب اس علاقے کے عوام کی جان، عزت اور بقا کی ذمہ داری براہِ راست حکومت کے کندھوں پر آ چکی ہے۔ پاکستان میں اس ذمہ داری کی قانونی بنیاد دو اہم قوانین فراہم کرتے ہیں جن میں قومی آفات (روک تھام وامداد) ایکٹ 1958 اور قومی ڈیزاسٹر مینجمنٹ ایکٹ 2010 شامل ہیں۔ ان دونوں قوانین کو سامنے رکھا جائے تو آفت زدہ قرار دینے کے بعد حکومت کی ذمہ داریاں نہایت واضح، ہمہ گیر اور ناگزیر ہو جاتی ہیں۔

قومی آفات ایکٹ 1958 بنیادی طور پر ایک ہنگامی نوعیت کا قانون ہے، جو حکومت کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ غیر معمولی حالات میں فوری فیصلے کرے، وسائل کو اپنے کنٹرول میں لے اور انسانی جانوں کو بچانے کے لیے غیر معمولی اقدامات کرے۔ اس قانون کے تحت کسی علاقے کو آفت زدہ قرار دینے کے بعد حکومت اس بات کی پابند ہو جاتی ہے کہ متاثرہ آبادی کو فوری تحفظ فراہم کرے، انہیں خطرناک مقامات سے محفوظ علاقوں میں منتقل کرے، اور ان کے لیے خوراک، رہائش اور طبی امداد کا بندوبست کرے۔ یہ سب کچھ کسی احسان کے طور پر نہیں بلکہ ایک قانونی فرض کے طور پر انجام دینا ریاست کی ذمہ داری ہے۔

اس تناظر میں یہ حقیقت خاص طور پر توجہ طلب ہے کہ گزشتہ زلزلے کے بعد حکومت نے وادی چیپورسن کے صرف تین دیہات کو آفت زدہ قرار دیا ہے، حالانکہ زمینی حقائق اس کے برعکس ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پوری وادی چیپورسن اس قدرتی آفت سے متاثر ہوئی ہے اور وادی کے تمام چھ سو گھرانے کسی نہ کسی شکل میں خوف، عدم تحفظ اور نقصانات کا سامنا کر رہے ہیں۔ ایسے میں آفت کو چند دیہات تک محدود کر دینا نہ صرف حقائق سے انحراف ہے بلکہ قانون کی روح کے بھی منافی ہے، کیونکہ آفت کا پیمانہ سرکاری نقشے نہیں بلکہ عوام کی زندگیوں پر پڑنے والا اثر ہوتا ہے۔

قومی ڈیزاسٹر مینجمنٹ ایکٹ 2010 اس ذمہ داری کو مزید وسعت دیتا ہے اور ریاست کو محض ردِعمل دینے والی اتھارٹی کے بجائے ایک منصوبہ ساز اور جوابدہ ادارہ بناتا ہے۔ اس قانون کے تحت NDMA، PDMA اور DDMA جیسے ادارے اس لیے قائم کیے گئے کہ آفت کے بعد افراتفری کے بجائے ایک منظم اور مربوط ردِعمل سامنے آئے۔ آفت زدہ قرار دینے کے بعد حکومت پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف فوری ریلیف فراہم کرے بلکہ نقصانات کا باقاعدہ تخمینہ لگائے، متاثرین کی بحالی کے منصوبے ترتیب دے اور مستقبل میں ایسے خطرات سے بچاؤ کے لیے عملی اقدامات کرے۔ اگر آفت پورے علاقے کو لپیٹ میں لے چکی ہو تو ذمہ داری بھی پورے علاقے تک پھیل جاتی ہے، اسے انتظامی سہولت کی بنیاد پر محدود نہیں کیا جا سکتا۔

> **قومی آفات ایکٹ 1958 بنیادی طور پر ایک ہنگامی نوعیت کا قانون ہے، جو حکومت کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ غیر معمولی حالات میں فوری فیصلے کرے، وسائل کو اپنے کنٹرول میں لے اور انسانی جانوں کو بچانے کے لیے غیر معمولی اقدامات کرے۔ اس قانون کے تحت کسی علاقے کو آفت زدہ قرار دینے کے بعد حکومت اس بات کی پابند ہو جاتی ہے کہ متاثرہ آبادی کو فوری تحفظ فراہم کرے، انہیں خطرناک مقامات سے محفوظ علاقوں میں منتقل کرے، اور ان کے لیے خوراک، رہائش اور طبی امداد کا بندوبست کرے**

آفت زدہ علاقے میں رہائش کا مسئلہ سب سے بنیادی ہوتا ہے۔ خیمے، عارضی شیلٹرز، یا محفوظ عمارتیں فراہم کرنا حکومت کی اولین ذمہ داری بن جاتی ہے۔ اسی طرح صاف پانی، خوراک، ایندھن اور موسم کی شدت سے بچاؤ کے انتظامات ریاستی فرض میں شامل ہیں۔ اگر متاثرہ آبادی کو سردی، بھوک یا بیماری کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے تو یہ صرف انتظامی ناکامی نہیں بلکہ آئین کے آرٹیکل 9، یعنی حقِ زندگی، کی صریح خلاف ورزی بھی ہے۔ چیپورسن جیسے سرد اور دشوار گزار علاقے میں یہ ذمہ داری مزید حساس اور فوری نوعیت اختیار کر لیتی ہے۔

طبی امداد کے حوالے سے دونوں قوانین حکومت کو اس بات کا پابند بناتے ہیں کہ زخمیوں کے علاج میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہو، فیلڈ اسپتال اور موبائل ہیلتھ یونٹس قائم کیے جائیں، اور وبائی امراض سے بچاؤ کے لیے حفاظتی اقدامات کیے جائیں۔ آفت کے بعد بیماریوں کا پھیلاؤ ایک معروف خطرہ ہوتا ہے، اور اس خطرے سے نمٹنا حکومت کی براہِ راست ذمہ داری ہے، نہ کہ کسی فلاحی ادارے پر چھوڑ دینے کا معاملہ۔

مالی اور معاشی پہلو بھی اتنا ہی اہم ہے۔ آفت زدہ قرار دیے جانے کے بعد حکومت پر لازم ہے کہ وہ گھروں، فصلوں، مویشیوں اور روزگار کے نقصانات کا شفاف سروے کرائے اور متاثرین کو مالی امداد، گرانٹس یا دیگر سہولیات فراہم کرے تاکہ وہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ قومی ڈیزاسٹر مینجمنٹ ایکٹ 2010 واضح طور پر بحالی اور تعمیرِ نو کو ریاستی ذمہ داری قرار دیتا ہے، محض وقتی امداد کو نہیں۔ جب متاثرین کی تعداد پوری وادی پر محیط ہو تو بحالی کا دائرہ بھی پوری وادی تک ہونا چاہیے۔

ان دونوں قوانین کے تحت حکومت کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ ذخیرہ اندوزی، منافع خوری اور بلیک مارکیٹنگ کے خلاف سخت کارروائی کرے۔ آفت زدہ علاقوں میں اشیائے ضروریہ کی قیمتوں کو کنٹرول میں رکھنا اور استحصالی عناصر کو لگام دینا حکومت کا فرض ہے، کیونکہ ایسے حالات میں معاشی استحصال انسانی المیے کو دوچند کر دیتا ہے۔

سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ قومی ڈیزاسٹر مینجمنٹ ایکٹ 2010 حکومت کو مستقبل کے بارے میں سوچنے کا پابند بناتا ہے۔ اگر کوئی علاقہ مسلسل خطرات کی زد میں ہو تو ریاست پر لازم ہے کہ وہ سائنسی اور تکنیکی بنیادوں پر فیصلہ کرے کہ وہاں محفوظ تعمیر ممکن ہے یا نہیں۔ اگر خطرات مستقل نوعیت کے ہوں تو متاثرہ آبادی کی باعزت منتقلی اور متبادل آبادکاری پر غور کرنا بھی ریاستی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ چیپورسن کے معاملے میں بھی ضرورت اس امر کی ہے کہ وقتی اعلانات کے بجائے پورے خطے کو آفت زدہ قرار دے کر ان دونوں قوانین کے تحت فوری، سخت اور جامع اقدامات اٹھائے جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آفت زدہ قرار دینے کے بعد ریاست کسی تماشائی کا کردار ادا نہیں کر سکتی۔ قانون اسے مکمل اختیار بھی دیتا ہے اور مکمل ذمہ داری بھی۔ 1958 کا قانون حکومت کو فوری طاقت دیتا ہے، جبکہ 2010 کا قانون اس طاقت کے ساتھ جوابدہی، منصوبہ بندی اور پائیدار حل کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر ریاست ان ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتی تو مسئلہ محض انتظامی کمزوری نہیں رہتا بلکہ ایک سنجیدہ آئینی اور انسانی حقوق کا بحران بن جاتا ہے، جس کا خمیازہ ہمیشہ عام شہری ہی بھگتتا ہے۔

☆☆☆

تھرپارکر کے ہاریوں کی صدا

توصیف احمد خان

تھرپارکر کا شمار ملک کے سب سے زیادہ پسماندہ اضلاع میں ہوتا ہے۔ تھر پارکر ایک وسیع العریض صحرا ہے جس کی سرحدیں پاکستان سے بھارت تک پھیلی ہوئی ہیں۔ تھرپارکر کا ہیڈکوارٹر مٹھی ہے، جو ایک چھوٹا شہر ہے اور یہ 6 تعلقوں مٹھی، ننگر پارکر، چھاچھرو، اسلام کوٹ، ڈاھلی، ڈیپلو اور کلوئی اور 60 یونین کونسلوں پر مشتمل ہے۔ تھرپارکر کی کل آبادی 12 لاکھ بتائی جاتی ہے۔ تھرپارکر کا صرف 8.12 فیصد حصہ شہری اور بقیہ دیہی آبادی پر مشتمل ہے۔ تھرپارکر میں خواندگی کا تناسب 36.39 فیصد بتایا جاتا ہے۔ خواندگی سے متعلق اعداد و شمار پر نظر ڈالتے ہی واضح ہوتا ہے کہ مردوں میں خواندگی کا تناسب 48.50 فیصد اور خواتین میں یہ تناسب 23.49 فیصد ہے۔ تھرپارکر کے شہریوں کا بنیادی پیشہ زراعت ہے یا بہت سے لوگوں کا گزارہ زراعت سے ملحقہ کاموں سے ہوتا ہے۔

تھرپارکر میں زراعت کے لیے پانی کا دارومدار برساتی پانی پر ہوتا ہے۔ جب مہینوں بارش نہیں ہوتی تو پھر قحط کی صورتحال پیدا ہوجاتی ہے۔ ہزاروں افراد زندگی بچانے کے لیے دیگر علاقوں میں ہجرت پر مجبور ہوتے ہیں۔ آبادی کا بہت معمولی حصہ سرکاری محکموں میں ملازمت کرتا ہے۔ کچھ لوگ تجارت کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ اس علاقے کی آبادی کا 77.64 فیصد حصہ مال مویشیوں کی پیدائش اور خرید و فروخت کے کاروبار سے منسلک ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق تھرپارکر کے لوگوں کے لیے اونٹ کی بڑی اہمیت ہے۔ اونٹ بار برداری اور سواری کے لیے سب سے اچھا جانور سمجھا جاتا ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق تھرپارکر قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ تھرپارکر میں کوئلہ کے 185.175 بلین ٹن کے ذخائر موجود ہیں۔ چند سال قبل چین سے ہونے والے سی پیک معاہدے کے تحت چین نے تھرپارکر میں کوئلہ سے بجلی پیدا کرنے کا ہیوی پلانٹ لگایا ہے۔ اس پلانٹ نے برسوں پہلے بجلی بنانی شروع کردی تھی مگر یہ بجلی تھرپارکر کے عوام کو فراہم نہیں کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ تھرپارکر کے عوام سولر بجلی استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ تھرپارکر کے ایک مکین سینئر صحافی سہیل سانگی نے لکھا ہے کہ تھرپارکر کا بیشتر علاقہ 2025 میں بھی بجلی کی نعمت سے محروم ہے۔ اقوام متحدہ کے ترقیاتی ادارہ UNDP کی ایک رپورٹ میں لکھا گیا تھا کہ تھرپارکر کی 87 فیصد آبادی خط غربت کے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہے، یوں تھرپارکر ضلع میں زچہ اور نوزائیدہ بچوں کی اموات کی شرح ملک بھر میں سب سے زیادہ ہے۔

ایک یونیورسٹی کے سروے کے مطابق تھرپارکر میں 90 فیصد خواتین کم غذائیت کے مرض کا شکار ہیں۔ تھرپارکر میں روزگار کی صورتحال خاصی خراب ہے۔ وہاں کی مشہور فصلوں میں باجرہ، گوار، مونگ، موٹھ تل وغیرہ کی فصل ہوتی ہے۔ بارشوں سے زرعی زمین آباد ہوتی ہے اور پیدا شدہ اجناس مارکیٹ میں فروخت کر کے ضروریات زندگی پوری کرتے ہیں۔ محکمہ ریونیو کے اعداد شمار کے موجب تھرپارکر میں 6 لاکھ 24 ہزار 42 کاشتکار کھاتیدار ہیں جن کے پاس 2 ایکڑ سے لے کر 200 ایکڑ زرعی زمین کے کھاتے ہیں۔ اس ایگریکلچر لینڈ سے 7 ہزار 6 سو 74 ایکڑ بیراجی زمین ہے جب کہ 6 لاکھ 57 ہزار ایکڑ بارانی زمین ہے، جس کی کاشت بارشوں پر منحصر ہوتی ہے۔

تھر کے معروف ادیب معصوم تھری کے مطابق تھر کی بارانی زمین میں موسمی مطلوبہ بارشیں ہونے کی صورت میں ایک ایکڑ سے ایک ٹن پیداوار ممکن ہے لیکن گزشتہ کئی برسوں سے مطلوبہ موسمی بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے یہ ایوریج 20 سے 30 فیصد رہ گیا ہے، جب کہ فی ایکڑ لاگت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ کاشتکار/کسان کی ایک ایکڑ پر کم از کم ایک لاکھ روپے لاگت ہوتی ہے اور ایک خاندان کے 4 سے 5 فرد 5 سے 6 ماہ دیگر محنت مزدوری چھوڑ کر کاشتکاری سے جڑے رہتے ہیں، اگر مطلوبہ بارشیں نہ ہوں تو مجموعی طور پر بیج اور دوسرے اخراجات کی مد لگائے گئے 4 سے 5 ارب روپے ڈوب جاتے ہیں اور کاشت کار کسان شدید مالی بحران کا شکار ہوکر کسمپرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے اور یہ صورت حال ہر دوسرے، تیسرے سال پیش آتی ہے۔ سرکاری ملازمتوں سے وابستہ ایماندار ملازمین کا تنخواہ پر گزارہ نہیں ہوتا تو وہ بھی ان سود خوروں سے رابطہ پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

اس سارے ماجرے میں گزشتہ 10 سے 15 برسوں سے سود خور تاجروں نے تو غریب کسان کا شتکار کی کمر توڑ کے رکھ دی ہے۔ کسان کاشتکار کے پاس مون سون کی موسم آتے ہی کاشتکاری کی تیاری کے سلسلے میں بیج اور دیگر اخراجات کے لیے مقامی سود خور بیوپاری کے یہاں چل کر جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہوتا ہے۔ اب سود خور بیوپاری کیا کرتا ہے کہ اول تو وہ بیج مہنگے دام پر دیتا ہے جو بیج 3 ہزار روپے فی من فروخت کرتا ہے، وہی فصل مارکیٹ میں آنے پر اسی کسان سے 1500 روپے میں خرید کرنے کا معاہدہ کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ماہانہ پانچ فیصد سود بھی وصول کرتا ہے۔

یہ کاروبار مٹھی، چھاچھرو، ننگر پارکر، اسلام کوٹ اور دیگر شہروں میں کھلم کھلا جاری وساری ہے۔ پہلے یہ گھناؤنا کاروبار مقامی سود خور کرتے تھے لیکن تھر کے مذکورہ شہروں میں افغانی پٹھانوں نے بھی ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور اب یہ کاروبار سیزنل نہیں رہا بلکہ روزمرہ کا کاروبار بن کر رہ گیا ہے جس کی چنگل میں تھر کے غریب اور پسے ہوئے کسانوں اور مزدوروں کے ہزاروں خاندان پھنسے ہوئے ہیں اور زندگی اجیرن بنی ہوئی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی سندھ کے سیکریٹری کامریڈ اقبال جو ہاری کمیٹی کے پلیٹ فارم سے جدوجہد کررہے ہیں، ان کا بیانیہ ہے کہ یہ غیر قانونی سود خور حضرات نہایت ظالمانہ شرح سود وصول کررہے ہیں، مقروض افراد کے سونے کے زیورات، چیک بک، اے ٹی ایم کارڈز اور دیگر ضمانتیں اپنے قبضے میں رکھتے ہیں اور بعض صورتوں میں مکمل ادائیگی کے باوجود رہن رکھی ہوئی اشیاء واپس کرنے سے انکار کردیتے ہیں۔

یہ طرزِ عمل فوجداری ضابطہ پاکستان کی دفعات 406، 420، اور 384 کے تحت قابلِ سزا جرائم ہیں اور آئینِ پاکستان کے آرٹیکل 4، 9، اور 23 میں دیے گئے شہریوں کے جان، مال، عزت اور تحفظ کے بنیادی حقوق کی بھی خلاف ورزی ہے۔ مزید یہ کہ غریب اور ناخواندہ تھری عوام ان غیر قانونی کارروائیوں کا سب سے زیادہ نشانہ بن رہے ہیں۔ مالی مجبوری کے باعث وہ چھوٹی رقمیں زبانی معاہدوں کے تحت قرض لیتے ہیں، جنھیں یہ سود خور حضرات ناجائز فائدہ اٹھا کر دگنا تگنا سود لگا کر لوٹتے ہیں، اور ان کے زیورات وضمانتیں مستقل طور پر اپنے قبضے میں رکھتے ہیں۔ کامریڈ اقبال نے ایک مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ ایک قرض دینے والے شخص نے متعدد مقامی قرض داروں کے تقریباً 90 لاکھ روپے مالیت کے سونے کے زیورات غیر قانونی طور پر اپنے قبضے میں رکھے ہوئے ہیں۔ یہ تمام لین دین زبانی طور پر کیے گئے تھے، جن کی کوئی قانونی دستاویزات موجود نہیں، جس سے دھوکہ دہی اور خیانت کو فروغ ملا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ ان افراد کے خلاف ان قوانین کے تحت کارروائی ہوسکتی ہے جن میں دفعہ 3 اور 4، پرائیویٹ لون ایکٹ 2023 (بغیر لائسنس قرض دینے اور سود وصول کرنے پر ممانعت)، دفعہ 406 اور 420 پاکستان پینل کوڈ (خیانتِ مجرمانہ اور دھوکہ دہی)، دفعہ 384 پاکستان پینل کوڈ (زبردستی اور بھتہ خوری) اور دفعہ 506 پاکستان پینل کوڈ (دھمکی اور خوفزدہ کرنے کے جرائم) شامل ہیں۔ علاقہ کے لوگوں نے سندھ کے انسپکٹر جنرل پولیس سے اپیل کی ہے کہ ان سود خوروں سے ان کا قیمتی سونا اور سامان واپس کرایا جائے اور ایسی اسکیم شروع کی جائے کہ غریب لوگ ان سود خوروں کے جھانسے میں نہ آئیں۔

تھرپارکر کے منتخب اراکین کا تعلق ہمیشہ پیپلز پارٹی سے رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کی ذمے داری ہے کہ ان غریب لوگوں کو سود خوروں سے بچانے کے لیے کوئی ایسی اسکیم شروع کرے کہ عام آدمی کو بغیر سود کے قرضہ مل سکے۔

(بشکریہ ایکسپریس نیوز)

پاکستان میں اقلیتوں کی جدوجہد: مشکلات اور سفارشات

راجہ انیل

پسماندہ کمیونٹیز کو جبری مزدوری، اپنی آزادیوں پر پابندیوں، اور منظم استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے

اتحاد اور مساوات کے اصول کی قانونی بنیاد آئین پاکستان (1973) میں موجود ہے۔ آرٹیکل 20 مذہب پر یقین رکھنے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی کو یقینی بناتا ہے۔ آرٹیکل 25 کہتا ہے کہ تمام شہری برابر ہیں اور قانون کے تحت مساوی تحفظ کے مستحق ہیں۔ آرٹیکل 36 ریاست کو اقلیتوں کے قانونی حقوق اور مفادات کا تحفظ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مزید برآں، 26 مئی 2009 کو ایک سرکاری نوٹیفکیشن کے ذریعے سرکاری شعبے میں اقلیتوں کے لیے پانچ فیصد کوٹہ متعارف کرایا گیا تھا۔ اس کا مقصد قومی ترقی میں اقلیتوں کی شرکت کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ مزید برآں، پاکستان ہر سال (2009 سے) 11 اگست کو اقلیتوں کا قومی دن مناتا ہے۔ اس دن کو منانے کا مقصد معاشرے میں بین المذاہب ہم آہنگی اور رواداری کو فروغ دینا ہے۔

کسی بھی قوم کی حقیقی طاقت نہ صرف اس کی معاشی ترقی میں مضمر ہے بلکہ اس بات میں بھی ہے کہ وہ اپنی کمزور ترین کمیونٹیز کے ساتھ کس طرح برتاؤ کرتی ہے۔ اپنے قیام کے بعد سے، پاکستان نے ایسے گروہوں، خاص طور پر مذہبی اقلیتوں، خواتین اور بچوں کے تحفظ کے لیے اہم اقدامات کیے ہیں۔ پھر بھی، غیر مؤثر نفاذ اور محدود وسائل کی وجہ سے مشکلات باقی ہیں۔

آئین کا آرٹیکل 25 الف 5 سے 16 برس کی عمر کے تمام بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا حکم دیتا ہے۔ تاہم، کمزور نفاذ اور محدود وسائل کی وجہ سے اس پر مؤثر عمل درآمد نہیں ہو سکا ہے۔ یہ ایک نامناسب حقیقت ہے کہ معیاری تعلیم کی کمی اقلیتوں اور اکثریتی آبادی دونوں کو متاثر کرتی ہے، تاہم اقلیتیں اکثر زیادہ شدید متاثر ہوتی ہیں۔ لہٰذا، تعلیم تک رسائی کی کمی بہت سے سماجی مسائل جیسے کم عمری کی شادی، غربت اور بے روزگاری کا باعث بنتی ہے۔ یہ مسائل سیاسی عدم استحکام پیدا کرتے ہیں اور قومی ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ پسماندہ کمیونٹیز کو جبری مزدوری، اپنی آزادیوں پر پابندیوں، اور منظم استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

توہین رسالت کے قوانین کا غلط استعمال اور جبری تبدیلی مذہب کے واقعات میں تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں ملک کو مذہبی عدم برداشت اور انتہا پسندی کے پنجرے کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔

سینٹر فار سوشل جسٹس (سی ایس جے) کی جانب سے کی گئی تحقیق کے مطابق، جنوری 2021 سے دسمبر 2024 کے درمیان، جبری تبدیلی کے کم از کم 421 واقعات رپورٹ ہوئے۔ متاثرین میں 282 ہندو لڑکیاں، 137 مسیحی اور 2 سکھ شامل ہیں، جن میں سے تقریباً 71 فیصد نابالغ ہیں، اور زیادہ تر کیس سندھ سے رپورٹ کیے گئے ہیں۔ کئی کیسز رپورٹ نہ ہونے کا امکان ہے۔ بہت سی دوسری رپورٹیں یہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ پاکستان میں اقلیتوں کو اسکولوں، کام کی جگہوں اور محلوں میں امتیازی سلوک کا سامنا ہے۔ وہ معیاری تعلیم اور روزگار کے مواقع تک رسائی سے محروم ہیں۔

> **آئین کا آرٹیکل 25 الف 5 سے 16 برس کی عمر کے تمام بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا حکم دیتا ہے۔ تاہم، کمزور نفاذ اور محدود وسائل کی وجہ سے اس پر مؤثر عمل درآمد نہیں ہو سکا ہے۔ یہ ایک نامناسب حقیقت ہے کہ معیاری تعلیم کی کمی اقلیتوں اور اکثریتی آبادی دونوں کو متاثر کرتی ہے، تاہم اقلیتیں اکثر زیادہ شدید متاثر ہوتی ہیں۔ لہٰذا، تعلیم تک رسائی کی کمی بہت سے سماجی مسائل جیسے کم عمری کی شادی، غربت اور بے روزگاری کا باعث بنتی ہے۔ یہ مسائل سیاسی عدم استحکام پیدا کرتے ہیں اور قومی ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔**

ان مسائل میں بہت سے عوامل کارفرما ہیں۔ تاہم، ایک بڑا چیلنج اقلیتوں کے تحفظ کے لیے مضبوط اور طاقتور قانونی فریم ورک کی عدم موجودگی ہے، خاص طور پر جبری تبدیلی مذہب اور توہین مذہب کے قوانین کے غلط استعمال کے خلاف۔ اگرچہ سندھ اسمبلی نے نومبر 2016 میں فوجداری قانون (اقلیتوں کا تحفظ) بل منظور کیا تھا، تاہم گورنر نے بغیر توثیق کے واپس کر دیا تھا۔ 2019 میں پیش کیا گیا ایک نظر ثانی شدہ بل مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کی شدید مخالفت کی وجہ سے مسترد کر دیا گیا۔ اس بل کا مقصد جبری تبدیلی مذہب اور کم عمر لڑکیوں کی رضامندی کے بغیر شادی میں ملوث افراد کو سزا دینا تھا۔ اسی طرح، جبکہ اقلیتوں کے لیے قومی اور صوبائی اسمبلیوں اور دیگر سرکاری شعبوں میں نشستیں محفوظ ہیں، ان اقدامات سے ابھی تک خاطر خواہ تبدیلی لانا باقی ہے (مثال کے طور پر، سی ایس جے نے رپورٹ کیا کہ 2021 میں وفاقی محکموں اور پنجاب اور خیبر پختونخواہ میں اقلیتی کوٹہ کی تقریباً 28,854 آسامیاں خالی ہیں)۔

نتیجے کے طور پر، پاکستان کی اجتماعی ترقی میں اقلیتی برادریوں کے تعاون کو تسلیم کرتے ہوئے ان نقائص کو دور کرنا ضروری ہے۔ پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اقلیتوں کو کوٹے تک محدود رہنے کی بجائے معیاری تعلیم، مساوی مواقع، انصاف پسندی اور میرٹ کے کھلے نظام تک رسائی فراہم کی جانی چاہیے۔ عدلیہ اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ آرٹیکل 20، 25، 25-الف، اور 36 میں درج آئینی حقوق کو من وعن برقرار رکھا جائے۔ توہین رسالت کے قوانین کا غلط استعمال، جبری تبدیلی مذہب اور کم عمری کی شادیوں کو مکمل طور پر جرم قرار دیا جائے۔ مزید برآں، ریاست کو جبری تبدیلی کو روکنے اور اقلیتی خواتین کو استحصال اور بدسلوکی سے بچانے کے لیے قانون منظور کرنا چاہیے۔

حکومت کو 2014 کے از خود کیس نمبر PLD 2014 SC 699)) میں سپریم کورٹ کے فیصلے کو بھی نافذ کرنا چاہیے، جس میں اقلیتوں کے حقوق کے لیے قومی کونسل تشکیل دینے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس کونسل پر اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ پر نظر رکھنے، امتیازی سلوک کے واقعات کی رپورٹنگ، نفرت انگیز مواد کو روکنے کے لیے تعلیمی نصاب پر نظر ثانی کرنے، اور بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے ذمہ داری ہونی چاہیے۔ اسے نفرت انگیز تقاریر اور مذہبی عدم برداشت کے خلاف کارروائی کی بھی سفارش کرنی چاہیے جبکہ قانون نافذ کرنے والے ادارے کڑے احتساب کو یقینی بنائیں۔ آخر میں، ریاست کو انتظامی مسائل جیسے کہ شناختی کارڈ، پیدائشی سرٹیفکیٹ، اور شادی کے اندراج کی دستاویزات کی فراہمی کے معاملات کو حل کرنا چاہیے، یہ سب تعلیم اور ملازمت تک رسائی کے لیے ضروری ہیں۔ ان خدشات کو دور کرنے کے لیے متعلقہ کمیٹیاں قائم کی جائیں۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق، مجوزہ قومی کونسل برائے اقلیتوں کے حقوق کو تعلیم، اقلیتوں کے حقوق، نفاذ کے طریقہ کار اور ترقیاتی پروگراموں پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے بیداری کی ملک گیر مہم بھی شروع کرنی چاہیے۔

وقت کا تقاضا ہے کہ محروم کمیونٹیز کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جائے تاکہ قومی ترقی فخر اور شمولیت دونوں کے ساتھ آگے بڑھ سکے نہ کہ تعصب کے ساتھ۔

پاکستان میں خواتین کے ساتھ زیادتی

عصمت اللہ نیازی

افسوس ناک امر یہ ہے کہ ایسے واقعات وقت کے ساتھ ختم ہونے کے بجائے مختلف شکلوں میں سامنے آتے رہے ہیں

پاکستان میں خواتین کے ساتھ زیادتی یعنی جنسی تشدد جیسے بھیانک جرائم ماضی کی طرح آج کے جدید ڈیجیٹل دور میں بھی جاری ہیں۔اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ قوانین موجود ہونے کے باوجود نہ صرف ان پر مؤثر عمل درآمد میں بااثر معاشرتی طبقات رکاوٹ بنتے ہیں، بلکہ بعض اوقات عدالتی نظام میں بھی ایسے رویے سامنے آتے ہیں جو انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے میں مشکلات پیدا کرتے ہیں۔

حال ہی میں سپریم کورٹ آف پاکستان نے تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 376 کے تحت سنائی گئی بیس سال قید بامشقت کی سزا کو کم کر دیا۔اس فیصلے کی بنیاد ایف آئی آر کے اندراج میں سات ماہ کی تاخیر اور متاثرہ خاتون کے جسم پر تشدد کے نشانات کا موجود نہ ہونا قرار دی گئی۔جسٹس ملک شہزاد احمد خان، جسٹس عقیل احمد عباسی اور جسٹس صلاح الدین پنہوار پر مشتمل تین رکنی بینچ نے دو ایک کی اکثریت سے یہ فیصلہ سنایا، تاہم جسٹس صلاح الدین پنہوار نے اس فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے ایک مفصل اختلافی نوٹ تحریر کیا۔

اختلافی نوٹ میں جسٹس پنہوار نے واضح کیا کہ جنسی تشدد اور زیادتی کے واقعات اکثر رپورٹ ہی نہیں ہو پاتے کیونکہ متاثرین کو سماجی دباؤ اور ممکنہ نتائج کا شدید خوف لاحق ہوتا ہے۔انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ رپورٹ میں تاخیر کو استغاثہ کے لیے مہلک قرار دینا مناسب نہیں، کیونکہ ہمارے معاشرتی حالات میں تاخیر ایک فطری امر بن چکی ہے۔انہوں نے اس دلیل سے بھی اختلاف کیا کہ جسم پر تشدد کے نشانات نہ ہونے کی بنیاد پر ملزم کو فائدہ پہنچایا جائے، اور کہا کہ جب ملزم کے پاس ہتھیار ہو تو متاثرہ لڑکی مزاحمت سے گریز کر سکتی ہے۔اس کیس میں ٹرائل کورٹ نے 2017 میں بیس سال قید بامشقت کی سزا سنائی تھی، جسے لاہور ہائی کورٹ نے برقرار رکھا، تاہم سپریم کورٹ میں سزا کو کم کر دیا گیا۔ان فیصلوں اور ایف آئی آر میں درج تفصیلات کے باوجود اس قسم کا فیصلہ آنے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایسے معاملات میں تکنیکی خامیوں اور ایف آئی آر میں موجود نقائص پر غیر معمولی انحصار متاثرہ خواتین کے لیے انصاف کے حصول کو مزید مشکل تو نہیں بنا دیتا؟

پاکستان کی تاریخ خواتین کے خلاف تشدد کے واقعات سے داغدار رہی ہے، جن میں اکثر بااثر اور طاقتور طبقات ملوث رہے ہیں۔ 1980 کی دہائی میں جنوبی پنجاب کے علاقے نواب پور میں پیش آنے والا واقعہ اس کی ایک مثال ہے، جہاں انتقامی کارروائی کے طور پر خواتین کے ایک گروہ کو سرعام برہنہ کر کے گھمایا گیا۔افسوس ناک امر یہ ہے کہ ایسے واقعات وقت کے ساتھ ختم ہونے کے بجائے مختلف شکلوں میں سامنے آتے رہے ہیں، اور اب سوشل میڈیا کی بدولت ان میں سے کئی کیسز منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔

عدالت ہو، پارلیمان ہو یا معاشرے کے دیگر بااثر طبقات، یہ سوال بار بار اٹھتا ہے کہ سنگین جرائم میں ملوث افراد کس طرح نظام کے اندر مختلف قانونی راستے تلاش کر لیتے ہیں۔2008 میں سندھ سے تعلق رکھنے والے پیپلز پارٹی کے رکنِ قومی اسمبلی میر ہزار خان بجارانی پر 'کاروکاری' کے ایک مقدمے میں الزام تھا کہ انہوں نے جیکب آباد میں قتل کے تنازعے کو حل کرنے کے لیے پانچ کم سن لڑکیوں کو بطور 'ونی' دوسرے خاندان کے حوالے کیا۔بعد کے واقعات اور انجام نے اس کیس کو مزید سنگین بنا دیا۔

اسی طرح 2002 میں جنوبی پنجاب کے علاقے میر والا میں ایک پنچایت کے حکم پر مختاراں مائی کو اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔عالمی سطح پر شدید ردِعمل کے باوجود، بعد ازاں عدالتی فیصلوں میں کئی ملزمان کو بری کر دیا گیا اور ایک ملزم کی سزا میں کمی کی گئی۔مختاراں مائی نے اپریل 2011 میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد میڈیا سے گفتگو میں گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ انہیں اب عدالتی نظام پر بھروسہ نہیں رہا۔

حالیہ برسوں میں نور مقدم قتل کیس اور شاہنواز امیر کیس جیسے واقعات بھی عوامی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔اگرچہ ان کیسز میں عدالتی فیصلے سامنے آ چکے ہیں، لیکن اپیلوں اور قانونی پیچیدگیوں کے باعث انصاف کے فوری نفاذ پر سوالات اٹھتے رہے ہیں۔

اس سال جنوری کے آخر میں لاہور ہائی کورٹ میں ایک سماعت کے دوران ایڈووکیٹ جنرل پنجاب خالد اسحاق نے بتایا کہ اینٹی ریپ ایکٹ 2021 کے بعد ڈیڑھ لاکھ کے قریب کیسز رجسٹرڈ ہو چکے ہیں۔اسی تناظر میں عدالت میں یہ بات بھی زیرِ بحث آئی کہ صوبے میں ہر پندرہ منٹ بعد ایک ریپ کا واقعہ رپورٹ ہو رہا ہے۔اگرچہ یہ ممکن ہے کہ ان میں بعض کیسز جھوٹے یا غلط رپورٹنگ کا نتیجہ ہوں، تاہم مجموعی صورتحال کی سنگینی سے انکار ممکن نہیں۔

پاکستان نے گزشتہ دو دہائیوں میں خواتین کے تحفظ سے متعلق کئی قوانین منظور کیے ہیں، لیکن صنفی بنیاد پر تشدد کے مقدمات میں سزا کی شرح اب بھی نہایت کم بتائی جاتی ہے۔مختلف رپورٹس کے مطابق یہ شرح محض ایک سے ڈھائی فیصد کے درمیان ہے، جو انصاف کے نظام پر سنجیدہ سوالات اٹھاتی ہے۔خواتین کے لیے انصاف تک رسائی میں رکاوٹوں میں پیچیدہ عدالتی طریقہ کار، معاشرتی رویے، صنفی طور پر حساس بنیادی ڈھانچے کی کمی اور تفتیشی نظام کی کمزوریاں شامل ہیں۔قانون سازی اپنی جگہ اہم ہے، لیکن جب تک عدالتی رویوں میں حساسیت، قانون کے درست اطلاق اور متاثرہ فریق کے حالات کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی، اس وقت تک معاشرے کو ایسے سنگین جرائم سے محفوظ بنانا ممکن نہیں ہو سکے گا۔

(بشکریہ۔Voicepk.net)

تعلیم، جینڈر اور انسانی وقار: ایک تھکی ہوئی شناخت کی جدوجہد

ڈاکٹر علی زبیر

اگرچہ ٹرانسجینڈر پرسنز (پروٹیکشن آف رائٹس) ایکٹ 2018 کو صنفی اقلیتوں کے لیے ایک تاریخی اور دنیا کے چند ترقی پسند ترین قوانین میں شمار کیا گیا، کیونکہ اس نے پہلی بار ریاستی سطح پر خود شناخت کے اصول کو تسلیم کیا، مگر اس قانون کے بعد بننے والے 2020 کے قواعد نے اسی قانون کی بنیادوں کو کمزور کر دیا۔ ان قواعد کے تحت تمام صنفی اقلیتوں کو زبردستی ایک ہی خانے، یعنی ''ایکس (جینڈر مارکر)'' میں محدود کر دیا گیا، جو نہ صرف صنفی شناخت کے تنوع کی نفی ہے بلکہ خود اسی قانون کی صریح خلاف ورزی بھی ہے جو فرد کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنی صنفی شناخت کا تعین خود کرے۔ یہ اقدام دراصل ریاستی اختیار کے نام پر انسانی آزادی اور وقار کو محدود کرنے کی ایک واضح مثال ہے۔

اس قانونی تضاد کا سب سے تکلیف دہ اظہار عملی زندگی میں سامنے آتا ہے، خصوصاً تعلیم کے شعبے میں۔ آج بھی پاکستان میں بے شمار ٹرانسجینڈر افراد اپنی تعلیمی اسناد، بالخصوص سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری سطح پر، نام اور جنس کی تبدیلی کے لیے شدید مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔ تعلیمی بورڈز میڈیکل بورڈ کے سرٹیفکیٹ کا مطالبہ کرتے ہیں، حالانکہ 2018 کا قانون واضح طور پر یہ تسلیم کرتا ہے کہ صنفی شناخت کا تعین فرد کا ذاتی اور ناقابلِ تنسیخ حق ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اخبار میں نام اور جنس کی تبدیلی کا اشتہار دینا لازمی قرار دیا جاتا ہے، جو نہ صرف ذلت آمیز ہے بلکہ نجی زندگی کے حق کی صریح خلاف ورزی بھی ہے۔ بہت سے ٹرانسجینڈر افراد اپنی صنفی منتقلی کو عوامی سطح پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے، کیونکہ یہ ان کے لیے نفرت، تشدد، امتیازی سلوک اور سماجی بائیکاٹ کے خطرات کو بڑھا دیتا ہے۔

یہ تمام مراحل اس قدر تھکا دینے والے ہیں کہ وہ فرد جو پہلے ہی اپنی صنفی شناخت کے سفر میں سماجی دباؤ، خاندانی ردِعمل، تشدد، تضحیک اور اندرونی کشمکش سے گزر چکا ہوتا ہے، مستقبل میں مزید رکاوٹیں برداشت کرنے کی سکت کھو بیٹھتا ہے۔ ایک ایسا انسان جس نے اپنی پوری زندگی ''اپنے آپ ہونے'' کی جدوجہد میں گزار دی ہو، جب اسے ہر تعلیمی ادارے اور ہر سرکاری دفتر میں دوبارہ اپنی شناخت ثابت کرنی پڑے تو یہ محض انتظامی عمل نہیں رہتا بلکہ ایک مسلسل ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی اذیت بن جاتا ہے۔ یہ تھکن وقت کے ساتھ امید کو کمزور اور اعتماد کو مجروح کر دیتی ہے، اور ریاستی نظام سے مکمل بیگانگی کو جنم دیتی ہے۔

اعلیٰ تعلیمی اداروں کا رویہ اس بحران کو مزید گہرا کر دیتا ہے۔ یونیورسٹیاں قانون پر عمل درآمد کرنے کے بجائے عدالت کے فیصلے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اگر ہر ٹرانسجینڈر طالب علم کو اپنی شناخت تسلیم کروانے کے لیے عدالت جانا پڑے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قانون سازی کا مقصد کیا رہ جاتا ہے؟ کیا قانون صرف کتابوں اور تقاریر تک محدود ہے، یا اس کا مقصد عملی تحفظ فراہم کرنا بھی تھا؟ عدالت کا تقاضا دراصل ایک خاموش انکار ہے، جو یہ پیغام دیتا ہے کہ ٹرانسجینڈر افراد کو آج بھی مکمل شہری تسلیم نہیں کیا گیا۔

یہ پوری صورتحال پاکستان کے آئین کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ آئین کا آرٹیکل 4 ہر شہری کو قانون کے مطابق برتاؤ اور تحفظ کا حق دیتا ہے، آرٹیکل 9 زندگی اور شخصی آزادی کی ضمانت دیتا ہے، آرٹیکل 14 انسانی وقار اور نجی زندگی کے تحفظ کو تسلیم کرتا ہے، جبکہ آرٹیکل 25 تمام شہریوں کے درمیان مساوات کی بات کرتا ہے۔ جب ریاستی ادارے خود ان آئینی ضمانتوں کو نظرانداز کریں تو یہ محض انتظامی ناکامی نہیں بلکہ ایک سنجیدہ انسانی حقوق کا بحران بن جاتا ہے۔

ٹرانسجینڈر افراد کسی خصوصی رعایت یا اضافی مراعات کا مطالبہ نہیں کر رہے۔ وہ صرف وہی حق مانگ رہے ہیں جو قانون اور آئین نے پہلے ہی انہیں دیا ہے: باعزت زندگی، اپنی شناخت کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کا حق، اور بغیر ذلت و خوف کے ریاستی نظام تک رسائی۔ جب ایک انسان اپنی شناخت کی جدوجہد میں مسلسل تھکتا چلا جائے اور ریاست اس تھکن کو تسلیم کرنے کے بجائے مزید رکاوٹیں کھڑی کر دے، تو یہ ناانصافی نہیں بلکہ ظلم کی ایک شکل بن جاتی ہے۔ جب تک قانون کی روح کو عملی طور پر نافذ نہیں کیا جاتا اور تعلیم کو انسانی وقار سے جوڑا نہیں جاتا، تب تک ترقی پسندی کے تمام دعوے محض الفاظ کا شور رہیں گے، اور ایک تھکی ہوئی شناخت انصاف کی منتظر رہے گی۔

بچے

بھاری قیمت بچے کیوں ادا کر رہے ہیں؟

خیبر وادی تیراہ کے بچوں کے لیے نقل مکانی کوئی ایک واقعہ نہیں، بلکہ ایک ایسی حالت ہے جس کے اندر وہ آنکھ کھولتے اور بڑے ہوتے ہیں۔ گزشتہ ایک دہائی سے زائد عرصے میں بدامنی، عسکریت پسندی اور مسلسل غیر یقینی نے ہزاروں خاندانوں کو بار بار اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا ہے۔ ہر نقل مکانی اپنے ساتھ نقصان لاتی ہے، مگر بچوں کے لیے یہ نقصان اکثر اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب کوئی سانحہ اسے سب کے سامنے لے آتا ہے۔ باڑہ کے علاقے شلوبر میں، ایک مقامی اسکول کے قریب، ایک سالہ حسن اس وقت جاں بحق ہو گیا جب اس کے خاندان کی عارضی رہائش گاہ کا بوسیدہ کمرہ اچانک گر گیا۔ حسن کے والد عثمان اپنے خاندان سمیت وادی تیراہ سے نقل مکانی کے بعد یہاں مقیم تھے۔ یہ کمرہ وقت، موسم اور انسانی رہائش کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ ریسکیو ٹیمیں فوری طور پر موقع پر پہنچیں، بچے کو ملبے سے نکال کر ہسپتال منتقل کیا گیا، مگر ڈاکٹر اس کی جان نہ بچا سکے۔ ایک اور واقعے میں، وادی تیراہ سے چراٹ کی جانب نقل مکانی کرنے والا ایک خاندان حادثے کا شکار ہو گیا جب ان کی گاڑی گہری کھائی میں جا گری۔ اس سانحے میں قبیلہ کمر خیل سے تعلق رکھنے والے دو بچے جاں بحق ہو گئے، جبکہ ان کے والدین شدید زخمی ہو گئے۔ مقامی افراد، پولیس اور امدادی ٹیموں نے فوری کارروائی کی، مگر یہ تیزی بھی ان جانوں کو واپس نہ لا سکی جو اس سفر میں کھو گئیں۔ یہ واقعات محض حادثات نہیں، بلکہ ایک گہرے انسانی بحران کی علامت ہیں۔ وہ بحران جہاں بچے غیر محفوظ عمارتوں میں رہنے پر مجبور ہیں، خطرناک راستوں پر سفر کرتے ہیں، اور ایسے حالات میں پرورش پاتے ہیں جو انسانی وقار کے تقاضے پورے نہیں کرتے۔ عارضی بندوبست برسوں پر محیط ہو چکے ہیں۔ معلومات واضح نہیں ہوتیں، اور امداد ہر جگہ یکساں طور پر نہیں پہنچ پاتی۔ بچے اس بوجھ کو خاموشی سے اٹھاتے ہیں۔ بار بار نقل مکانی کے باعث ان کی تعلیم متاثر ہوتی ہے۔ شدید سردی اور سخت موسم میں مناسب سہولیات نہ ہونے کے باعث وہ بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ ایک ایسے ماحول میں بڑے ہو رہے ہیں جہاں خوف، غیر یقینی اور محرومی معمول بن چکے ہیں۔ انسانی اصول وقار، غیر جانبداری اور انسانیت کا تقاضا کرتے ہیں، مگر یہ وقار اس وقت کمزور پڑ جاتا ہے جب خاندان بوسیدہ کمروں، خالی عمارتوں یا عارضی پناہ گاہوں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ امداد کی غیر جانبدار فراہمی ایک اصول ہے، مگر عملی طور پر اس میں خلا موجود ہیں۔ واضح معلومات کی کمی والدین کو بے یقینی میں مبتلا رکھتی ہے، اور اس بے یقینی کی قیمت بچے ادا کرتے ہیں۔ وادی تیراہ کی نقل مکانی کو اکثر سکیورٹی یا انتظامی زاویے سے دیکھا جاتا ہے، مگر شاذ ہی اس بات پر توجہ دی جاتی ہے کہ یہ ایک پوری نسل کا بچپن عدم استحکام میں گزر رہا ہے۔ یہ بچے کسی بیانیے کا حصہ نہیں، بلکہ اس کے نتائج جھیل رہے ہیں۔ جب تک تیراہ کے بچے ایسی چھتوں کے نیچے محفوظ نیند نہیں سو سکتے جو کسی بھی لمحے گرنے کا خطرہ نہ رکھتی ہوں، جب تک ان کے سفر محفوظ نہ ہوں، اور جب تک خوف ان کی روزمرہ زندگی کا حصہ نہ رہے، تب تک انسانی ردعمل مکمل نہیں ہو سکتا۔ بچوں کا تحفظ کوئی اضافی نکتہ نہیں، بلکہ یہی وہ پیمانہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہم نے واقعی انسانیت کو مقدم رکھا ہے یا نہیں۔

(منظور آفریدی)

سال 2025: تنازعات و بحرانوں کی وجہ سے نظام ہائے صحت دباؤ میں رہے

کئی مہلک بیماریوں کے خاتمے سے لے کر زندگی کو تحفظ دینے والی ویکسین کی عام دستیابی یقینی بنانے تک، 2025 عالمگیر صحت عامہ میں بہتر پیش رفت کے حوالے سے نمایاں سال رہا۔ عالمی ادارہ صحت (ڈبلیو ایچ او) نے بتایا ہے کہ اگرچہ گزشتہ برس طبی شعبے پر دباؤ رہا جب بڑھتے مسلح تنازعات اور مشکلات نے دنیا بھر میں صحت کے سنگین مسائل کو جنم دیا لیکن نئے سال کے آغاز پر مستقبل کے حوالے سے قدرے امید ضرور دکھائی دیتی ہے۔ 2025 میں امدادی مالی وسائل میں کمی، جنگوں اور موسمیاتی تبدیلیوں کے اثرات نے دنیا بھر میں نظام ہائے صحت کو متاثر کیا اور کئی ممالک میں بنیادی طبی سہولیات میں خلل ڈالا۔ تاہم، اس کے باوجود حکومتوں اور شراکت دار اداروں نے بیماریوں پر قابو پانے، ان کی روک تھام اور مستقبل کے طبی مسائل سے نمٹنے کی تیاری کے ضمن میں اہم کامیابیاں حاصل کیں۔ 'ڈبلیو ایچ او' کے مطابق، 2025 میں صحت کے شعبے میں دباؤ اور پیش رفت کا یہ ملا جلا منظر نامہ اس بات کو اجاگر کرتا ہے کہ عالمگیر تعاون کی بدولت بہت کچھ ممکن ہے اور اگر بہتری کی جانب اقدامات کی رفتار سست پڑ گئی اور امدادی وسائل کی قلت رہی تو بہت کچھ خطرے میں پڑ جائے گا۔

بیماریوں کے خلاف کامیابیاں

گزشتہ سال کئی ممالک نے متعدی بیماریوں کے حوالے سے تاریخی سنگ میل عبور کیے۔ مالدیپ دنیا کا پہلا ملک بن گیا جس نے ماں سے بچے میں ایچ آئی وی، آتشک اور ہیپاٹائٹس بی کی منتقلی کا خاتمہ کیا۔ برازیل نے بھی ماں سے بچے میں ایچ آئی وی کی منتقلی ختم کر دی اور یوں وہ براعظم ہائے امریکہ میں یہ کامیابی پانے والا سب سے زیادہ گنجان آباد ملک بن گیا۔ گرم خطوں کی نظر انداز کردہ بیماریوں کے خلاف بھی پیش رفت ہوئی۔ برونڈی، مصر اور فجی نے ٹریکوما کا خاتمہ کیا۔ گنی اور کینیا نے سلیپنگ سکنس کو ختم کیا جبکہ نیجر افریقہ میں پہلا ملک بن گیا جس نے ریور بلائنڈنس پر قابو پایا۔ 2010 کے بعد ان بیماریوں کے علاج کے محتاج افراد کی تعداد میں تقریباً ایک تہائی کمی آ چکی ہے۔ تپ دق (ٹی بی) سے ہونے والی اموات میں بھی کمی کا سلسلہ جاری رہا۔ خاص طور پر افریقہ اور یورپ میں اس حوالے سے نمایاں پیش رفت دیکھنے کو ملی جہاں گزشتہ دہائی کے دوران اس مرض میں 45 فیصد سے زیادہ کمی ریکارڈ کی گئی۔ اس کے باوجود 2024 میں دنیا بھر کے ممالک میں اس بیماری سے اندازاً 12 لاکھ افراد ہلاک ہوئے تھے جو ایچ آئی وی، غذائی قلت اور دیگر عوامل

سے جڑے مسلسل خطرات کی یاد دہانی ہے۔

ملیریا پر قابو پانے میں بھی نمایاں پیش رفت ہوئی۔ جارجیا، سورینام اور تیمور لیستے کو ملیریا سے پاک ممالک قرار دیا گیا جبکہ افریقہ کے سات مزید ممالک نے ملیریا ویکسین متعارف کرائیں۔ بہتر مچھر دانیوں اور دیگر نئے ذرائع کے ساتھ ان اقدامات نے 2024 میں ملیریا کے اندازاً 17 کروڑ کیس اور 10 لاکھ اموات کو روکنے میں مدد دی۔

صحت عامہ میں تعاون

2025 بیماریوں کے خلاف کامیابیوں کے ساتھ عالمگیر طبی تعاون کے حوالے سے بھی اہم رہا۔ گزشتہ برس وبائی امراض پر قابو پانے سے متعلق دنیا کا پہلا معاہدہ منظور کیا گیا اور صحت کے بین الاقوامی ضوابط کو مضبوط بنایا گیا۔

عالمی رہنماؤں نے غیر متعدی بیماریوں اور ذہنی صحت پر ایک تاریخی سیاسی اعلامیے کی توثیق کی۔ اس کے علاوہ زچہ و بچہ کی دیکھ بھال، گردن توڑ بخار، حمل کے دوران ذیابیطس اور بچوں میں سرطان کے لیے موزوں ادویات کی تیاری سمیت کئی شعبوں میں نئے شواہد پر مبنی رہنما ہدایات جاری کی گئیں۔

غیر مساوی پیش رفت

2025 کے حوالے سے 'ڈبلیو ایچ او' کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق، مزید 1.4 ارب افراد اب پہلے کے مقابلے میں زیادہ صحت مند زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کی بڑی وجوہات تمباکو کے استعمال میں کمی، صاف ہوا اور پانی و صفائی کے نظام میں آنے والی بہتری ہے۔

اس میں حفاظتی ٹیکوں کا بھی مرکزی کردار رہا۔ دنیا بھر میں ویکسین کی مہمات نے 2000 کے بعد خسرہ سے ہونے والی اموات میں 88 فیصد کمی کی اور تقریباً 5 کروڑ 90 لاکھ جانیں بچائیں۔ 2025 میں کئی ممالک نے ہیومن پیپیلوما وائرس (HPV) کے خلاف ویکسین کی فراہمی کو وسعت دی جس سے رحم کے سرطان کو ختم کرنے کا ہدف مزید قریب آ گیا۔

تاہم، ادارے کا کہنا ہے کہ بہت سے مسائل اب بھی موجود ہیں۔ تنازعات، سپلائی میں رکاوٹوں اور غلط معلومات کے باعث گزشتہ سال 2 روڑ بچے بنیادی ویکسین سے محروم رہے۔ زچہ و بچہ کی اموات میں کمی کی رفتار بھی عالمی اہداف کے مطابق نہیں ہے جس سے بنیادی صحت کی سہولیات اور محفوظ زچگی پروگراموں میں مزید سرمایہ کاری کی ضرورت واضح ہوتی ہے۔

امدادی وسائل کی قلت

گزشتہ سال امدادی مالی وسائل میں کمی کے باعث زچہ و بچہ کی دیکھ بھال، ویکسینیشن، ایچ آئی وی سے بچاؤ اور بیماریوں کی نگرانی جیسی خدمات متاثر ہوئیں۔ 'ڈبلیو ایچ او' نے خبردار کیا ہے کہ اگر مالی معاونت میں کمی جاری رہی تو برسوں کی محنت سے حاصل کی گئی کامیابیاں ضائع ہو سکتی ہیں۔

مشکلات کے باوجود ادارے نے 79 ممالک اور علاقوں میں صحت کے ہنگامی حالات اور بحرانوں کے دوران فوری مدد فراہم کی جن میں غزہ، سوڈان اور یوکرین بھی شامل ہیں۔ ادارے نے وبائی امراض کے پہلے معاہدے اور بین الاقوامی طبی ضوابط میں لائی جانے والی بہتری کو بیماریوں پر قابو پانے کی تیاری کے لیے عالمی عزم کی علامت قرار دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ صحت کا اعلیٰ ترین ممکنہ معیار ہر انسان کا حق ہے جسے چند لوگوں تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ سائنس، بہترین طریقہ کار اور یکجہتی کی بدولت سبھی کے لیے مزید صحت مند، محفوظ اور پر امید مستقبل تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

(بشکریہ یو این خبر نامہ)

جلاوطنی میں خون کا بہاؤ

پاکستان میں پناہ گزین خواتین کے لیے ماہواری کی صحت انسانی حقوق کا اہم مسئلہ

ثمرہ نذیر، سماجی سائنسدان

2022 میں، اسلام آباد کے ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفس میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے ساتھ کوویڈ 19 - ویکسینیشن آگاہی پروگرام پر کام کرتے ہوئے، میں نے افغان مہاجرین کے کیمپوں میں فیلڈ ورک کیا۔ ایک دورے کے دوران، میں نے ایک نوجوان افغان خاتون سے ملاقات کی جس نے بتایا کہ وہ کس طرح پرانے کپڑوں سے پھٹے ہوئے کپڑے کے ٹکڑوں کو استعمال کر کے اپنی ماہواری کا انتظام کرتی ہے۔ اس نے ایک ہی کپڑے کو بار بار دھویا اور دوبارہ استعمال کیا، اکثر دھوئے بغیر۔ اس کی پریشانی صرف جسمانی تکلیف ہی نہیں تھی بلکہ انفیکشنز، نظر آنے والے داغوں اور کیمپ میں موجود دوسرے لوگوں کی طرف سے چہ مگوئیاں کا سامنا کرنے کا خوف تھا۔ اس تجربے نے اس بات پر روشنی ڈالی کہ کس طرح غربت، نقل مکانی، اور مناسب سہولیات تک رسائی کی کمی پناہ گزین خواتین کی ماہواری کی صحت کو براہ راست متاثر کرتی ہے۔

جس چیز کو اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ پناہ گزین خواتین کو درپیش چیلنجز اس مسئلے کی شدید ترین صورت ہے جس کا پاکستان میں لاکھوں خواتین پہلے ہی تجربہ کر رہی ہیں۔ ملک بھر میں، خواتین اور لڑکیاں اپنے ماہواری کا انتظام جن حالات میں کرتی ہیں اس سے ان کی صحت، وقار اور حفاظت متاثر ہوتی ہے۔ حیض کو ایک ایسی چیز کے طور پر سمجھا جاتا ہے جسے چھپایا جانا چاہئے۔ زیادہ تر دکانوں میں، سینیٹری پیڈز کو موٹے بھورے لفافوں میں، خاموشی سے اور آنکھوں سے رابطہ کیے بغیر دیا جاتا ہے، جیسے کہ پروڈکٹ خود ہی شرمناک ہو۔ لفافہ اکثر ضرورت سے بڑا ہوتا ہے، جو صرف اندر کی چیزوں کو چھپانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بہت سی خواتین کے لیے، پیڈ خریدنا ذلت آمیز ہے، جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ صحت کے لیے ضروری شے کی بجائے کوئی نامناسب چیز خرید رہی ہیں۔ بہت سی لڑکیاں اپنی پہلی ماہواری کا تجربہ کے دوران یہ سمجھ نہیں آتی کہ ان کے جسم کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ خوف اور الجھن عام ہے، اور کچھ کا خیال ہے کہ وہ بیمار یا زخمی ہیں۔ چونکہ گھر میں حیض کے بارے میں کم ہی بات کی جاتی ہے، اس لیے خاموشی معمول بن جاتی ہے، اور شرمندگی اوائل عمر سے ہی فہم و فراست کا حصہ بن جاتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ، خواتین کو صحت کی دیکھ بھال کی تلاش کے بجائے درد، تکلیف، اور صحت کے خدشات کو چھپانے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ جب حیض کو ممنوع معاملہ سمجھا جاتا ہے، تو عورتیں اس رسوائی کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیتی ہیں۔ بہت سی عورتیں خون بہنے، بدبو، یا لوگوں کی نظروں میں آنے کے حوالے سے فکرمند ہو جاتی ہیں اور درد، بے قاعدہ چکر، یا انفیکشن کے بارے میں کھل کر بات کرنے سے ہچکچاتی ہیں۔ اس سے دماغی صحت متاثر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ خواتین جو ماہواری کی مصنوعات برداشت کر سکتی ہیں تناؤ اور شرمندگی کا سامنا کرتی ہیں۔ بہت سے دیگر لوگوں کے لیے، قیمت بنیادی رکاوٹ ہے۔ پاکستان میں صرف 17 فیصد خواتین تجارتی طور پر تیار کیے جانے والے سینیٹری پیڈ استعمال کرتی ہیں، جب کہ 66 فیصد کپڑے پر انحصار کرتی ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماہواری کے معاملے میں کی غربت کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔

اس حقیقت کو ریاستی پالیسی سے تقویت ملتی ہے۔ صحت کے لیے ضروری ہونے کے باوجود سینیٹری پیڈ پر لگژری آئٹمز کے طور پر ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ دس پیڈز کے ایک پیکٹ کی قیمت تقریباً 450 روپے ہے، جبکہ پاکستان کی اوسط ماہانہ آمدنی تقریباً 120 ڈالر ہے۔ بہت سے خاندانوں کے لیے، یہ ایک وقت کھانے کی قیمت کے برابر ہے۔ 40 فیصد ٹیکس ہٹانے سے پیڈ مزید سستے ہو جائیں گے۔ ماہواری کے دوران صفائی بنیادی اور قبل از حمل صحت کی دیکھ بھال کا حصہ ہے، جس میں بیماریوں سے بچاؤ، تولیدی صحت کی تعلیم، اور ذہنی تندرستی شامل ہے۔ پیڈز کو غیر ضروری سمجھنا صحت عامہ کی ترجیحات سے متصادم ہے۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق، انسانی حقوق پر اپنے عوامی منشور (2024) میں، صحت کو بلا امتیاز سب کے لیے آئینی حق کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔ ماہواری کی صحت واضح طور پر اس فریم ورک کا حصہ ہے، اور اسے حل کرنا خواتین کے حقوق کے لیے حقیقی عزم کی عکاسی کرتا ہے۔

اگر عام شہریوں کو ان چیلنجز کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو مہاجرین کی صورت حال اس سے کہیں زیادہ خراب ہے۔ افغان پناہ گزین خواتین کے لیے، بے گھر ہونے، عدم تحفظ اور ہنگامی حالات کے دوران ماہواری جاری رہتی ہے لیکن انسانی ہمدردی کی منصوبہ بندی میں اسے شاذ و نادر ہی ترجیح دی جاتی ہے۔ محدود پانی، رازداری اور صحت کی دیکھ بھال کے ساتھ پرہجوم بستیوں میں رہنے والی پناہ گزین خواتین کو ان خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ان کی جسمانی اور نفسیاتی صحت دونوں کو متاثر کرتے ہیں۔

فیلڈ ورک کے دوران، میری ملاقات ایک نوعمر افغان لڑکی سے ہوئی جسے دو دن تک کپڑے کے ایک ہی ٹکڑے کو استعمال کرنے کے بعد تولیدی راستے میں شدید انفیکشن ہو گیا تھا۔ اس نے وضاحت کی کہ اس نے ٹوائلٹ استعمال کرنے کے لیے اندھیرے تک انتظار کیا تاکہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے، اور اس کے پاس تبدیل کرنے کے لیے کوئی اضافی کپڑا نہیں تھا۔ محدود پانی اور کوئی پرائیویٹ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے، اس نے اسی کپڑے کا استعمال جاری رکھا جب تک کہ اس کے جسم میں انفیکشن کے آثار ظاہر نہ ہو گئے۔ بعد میں اس نے درد، خارش اور بخار کا تجربہ کیا لیکن خوف اور شرمندگی کی وجہ سے اپنی دیکھ بھال میں تاخیر کی۔ جب تک وہ ایک کلینک پہنچی، اس کی حالت خراب ہو چکی تھی اور اس کے خاندان کو علاج کے لیے بہت زیادہ تگ و دو کرنی پڑی۔ اس کا تجربہ بتاتا ہے کہ رازداری کی کمی، ساز و سامان کی کمی اور سماجی بدنامی کس طرح بے گھر لڑکیوں کی صحت کو براہ راست نقصان پہنچاتی ہے۔

افغان پناہ گزین خواتین پر نفسیاتی اثرات نمایاں ہیں۔ بہت سے لوگ دائمی تناؤ، اضطراب، اور غیر علاج شدہ صحت کے حالات کے ساتھ رہتے ہیں، اور ماہواری میں درد، بہت زیادہ خون بہنا، اور انفیکشن اس بوجھ کو تیز کرتے ہیں۔ ثقافتی پابندیوں اور خواتین کے جسموں پر کنٹرول کے ماضی کے تجربات کی وجہ سے ماہواری یا تولیدی صحت کے بارے میں کھل کر بات کرنا مشکل ہے۔ یو این ایف پی اے کے مطابق، افغانستان میں زچگی کی شرح اموات کی شرح خطے میں سب سے زیادہ ہے، جہاں چودہ میں سے ایک عورت حمل سے متعلق وجوہات سے مرتی ہے۔ خواتین کی صحت کے حوالے سے یہ رویے نقل مکانی کے بعد ختم نہیں ہوتے اور جلاوطنی میں خواتین کے تجربات کو تشکیل دیتے رہتے ہیں۔

بہت سی افغان پناہ گزین خواتین غیر رسمی ملازمتوں جیسے گھریلو کام یا یومیہ اجرت پر کام کرتی ہیں۔ ان کے پاس صحت کی دیکھ بھال کی مفت سہولت، تنخواہ کی چھٹی، یا ملازمت کی حفاظت نہیں ہے۔ ماہواری کا درد کام کی توقعات کو کم نہیں کرتا۔ خواتین دردوں، انفیکشنز اور بہت زیادہ خون بہنے کے دوران سے کام جاری رکھتی ہیں کیونکہ ایک دن کا کام چھوڑنے کا مطلب آمدنی میں کمی ہو سکتی ہے۔ ماہواری سے متعلق بیماری کی چھٹی کو مزدوری اور صحت کے حق کے طور پر تسلیم کرنا ضروری ہے، خاص طور پر مہاجرین اور مہاجر خواتین کے لیے۔

ہمیں جس چیز پر توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ پناہ گزین خواتین اور لڑکیوں کو ماہواری سے متعلق صحت کے واضح حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ اس میں سینیٹری مصنوعات پر ٹیکس کا خاتمہ، انہیں صحت کی ضروری اشیاء کے طور پر درجہ بندی کرنا، اور صاف پانی، نجی بیت الخلاء، اور پناہ گزین کیمپوں میں فضلہ ٹھکانے لگانے کی مناسب سہولیات تک رسائی کو یقینی بنانا شامل ہے۔ پناہ گزینوں کو حفظان صحت کی مستقل فراہمی اور ماہواری کے معاملات میں حفظان صحت کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ نوجوان لڑکیوں کو یہ بھی سکھانا چاہیے کہ ماہواری کیا ہے۔ تعلیم اور رسائی کے ذریعے ماہواری کو معمول پر لانے سے پناہ گزین خواتین اور لڑکیوں کو حیض کا انتظام محفوظ، اعتماد اور وقار کے ساتھ کرنے کا موقع ملے گا۔

ان نقائص کا مشاہدہ کرنے والے ایک انٹرن کے طور پر، میں سمجھتی ہوں کہ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق جیسے اداروں کو حیض کے معاملے کو، خاص طور پر مہاجرین اور بے گھر خواتین کے لیے، انسانی حقوق کا اہم مسئلہ تسلیم کرتے ہوئے مضبوط کردار ادا کرنا چاہیے۔ کوالٹیٹیو ریسرچ کی فوری ضرورت ہے جو خواتین کے زندگی کے تجربات، نفسیاتی تناؤ، اور صحت کے نتائج کو قلم بند کیا جائے اور جو نقل مکانی جیسی صورتوں میں ماہواری کی ناقص رسائی سے متعلق معاملات کا احاطہ کرے۔ اس طرح کے شواہد مضبوط وکالت اور زیادہ جامع پالیسی پر مبنی اقدامات کو تقویت فراہم کریں گے۔

تنازعات، سیلاب، یا نقل مکانی کے دوران حیض نہیں رکتا۔ خواتین کی صحت اور عزت کے تحفظ کی ذمہ داری بھی ختم نہیں ہونی چاہیے۔ ماہواری کی صحت صرف خواتین کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ انسانی حقوق کا مسئلہ ہے، اور پناہ گزین خواتین کو اس گفتگو میں شامل کیا جانا چاہیے۔

صحافی پر حملہ

عمرکوٹ جنوری کو تحصیل پتھورو کے علاقے شادی پلی شہر میں بینظیر انکم سپورٹ پروگرام کے سینٹر پر مستحق عورتوں کو ملنے والی امدادی رقم کی کوریج کرنے کے دوران سندھ کے معروف اخبار روزانہ کاوش اخبار کے رپورٹر وصحافی اشرف لاشاری کو علاقے کے بااثر وڈیرے گلاب وجلو، اس کے بیٹے عباس اوران کے ساتھیوں نے ڈنڈوں اور کلہاڑی سے حملہ کر کے زخمی کر دیا۔ متاثر صحافی کو فوری طور پر علاج ومعالج کے لئے تعلقہ ہسپتال پتھورو منتقل کیا گیا جہاں طبی امداد دی گئی۔ زخمی صحافی کے مطابق مذکورہ بااثر وڈیرے کی طرف سے مجھے دو دن قبل کوریج نہ کرنے کے لئے موت کی دھمکیاں بھی دی تھیں۔ اس کے باوجود بھی جمعے کے دن میں اپنی صحافتی خدمات انجام دے رہا تھا کہ مذکورہ ملزمان نے حملہ کر کے مجھے مار پیٹ کا نشانہ بنا کر زخمی کر دیا۔ اس وقت امدادی سینٹر پر موجود افراد نے بیچ بچاؤ کر کے میری جان بچائی۔ حملے کے بعد بھی مذکورہ افراد جان سے مارنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ واقعے کے بعد شادی پلی پولیس نے متاثر صحافی اشرف لاشاری کی فریاد پر جوابدار گلاب وجلو، اس کے بیٹے عباس اور ساتھیوں کے خلاف درج کر کے ایک ملزم عباس وجلو کو گرفتار کر لیا۔ اس واقعے کے خلاف شادی پلی، پتھورو، غلام نبی شاہ، ڈھورونارو سمیت مختلف پریس کلب کے صحافیوں کی طرف سے سخت احتجاج کیا گیا اور خبردار کیا گیا کہ واقعے میں ملوث تمام ملزمان کو جلد گرفتار کیا جائے۔ (نامہ نگار)

16 دسمبر، سانحہ آرمی پبلک سکول پشاور

پشاور 16 دسمبر 2014 وہ دن ہے جب پشاور کے آرمی پبلک سکول میں ہونے والے انسانیت سوز حملے میں 149 بے گناہ جانیں ضائع ہوئیں، جن میں 132 معصوم بچے شامل تھے۔ آج گیارہ برس بعد بھی یہ سوال اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہے کہ آخر وہ حالات کیوں پیدا کیے گئے جن میں ہمارے بچوں کو یوں قربانی کا بکرا بنا دیا گیا؟ کہ سانحہ اے پی ایس کسی اچانک واقعے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ یہ دہائیوں پر محیط اس سکیورٹی پالیسی کی پیداوار تھا جو ریاستی طاقت کے مراکز میں بیٹھے پنجابی جرنیلوں نے پشتون وطن پر مسلط کی۔ افغان جہاد سے لے کر نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ تک، پشتون علاقوں کو تجربہ گاہ بنایا گیا، مسلح گروہوں کی سرپرستی کی گئی، 'اچھے' اور 'برے' طالبان کی تفریق پیدا کی گئی، اور پورے خطے کو مستقل جنگی معیشت میں جھونک دیا گیا۔ انہی پالیسیوں کے نتیجے میں خیبر پختونخوا اور قبائلی علاقوں میں اسی ہزار سے زائد جانیں ضائع ہوئیں، لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے، اور سماج کا تانا بانا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا۔ سانحہ اے پی ایس کے بعد نیشنل ایکشن پلان کے نام پر جو اقدامات کیے گئے، وہ بھی احتساب کے بجائے مزید عسکریت، ماورائے عدالت اقدامات، اور جبری گمشدگیوں کی صورت میں سامنے آئے۔ نہ تو ان پالیسی سازوں کا تعین ہوا جنہوں نے دہشت گردی کو بطور اثاثہ استعمال کیا، نہ ہی ان اداروں کا احتساب کیا گیا جن کی سرپرستی میں یہ عفریت پروان چڑھا۔ نتیجتاً، دہشت گردی کے اسباب کو ختم کرنے کے بجائے اس کے اثرات کو پشتون عوام پر مسلط کیا گیا۔ اے پی ایس کے شہداء کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا واحد راستہ مگر مچھ کے آنسو نہیں بلکہ اس سکیورٹی اسٹیٹ کے پورے ڈھانچے کو چیلنج کرنا ہے جو پشتون خون کو سستا اور جنگ کو مستقل پالیسی سمجھتی ہے۔ جب تک پشتون علاقوں میں عسکری تجربات بند نہیں ہوتے اس وقت تک نہ اے پی ایس جیسے سانحات رکیں گے اور نہ ہی حقیقی امن ممکن ہوگا۔

(مسعود شاہ)

متاثرین تاحال معاوضے کے منتظر ہیں

نوشکی 28 اپریل 2025 کو ٹرک اڈہ نوشکی میں ایرانی پیٹرول ٹرک میں آگ لگنے سے نوشکی کی تاریخ میں سب سے بڑی تباہی ہوئی تھی۔ اس سانحہ میں 36 افراد زندگی کی بازی ہار گئے اور درجنوں افراد زخمی ہوئے۔ ٹرک میں آگ بجھانے کیلئے میونسپل کمیٹی کے فائر بریگیڈ بھی آگ کی زد میں آ گئی جسے دو فائر مین جان بحق ہو گئے اور فائر بریگیڈ بھی مکمل طور پر جل کر خاکستر ہو گئی۔ نو ماہ کا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود بھی اتنے بڑے سانحہ کی تحقیقات کی رپورٹ سامنے نہیں آئی جو مختلف تحفظات اور خدشات کو جنم دینے کے ساتھ حکومتی اداروں کی کارکردگی پر بھی سوالیہ نشان ہے۔ 9 ماہ کا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود سانحہ میں جان بحق ہونے والوں کے لواحقین اور زخمیوں کو کوئی ریلیف نہیں ملا۔ البتہ سانحہ کے تین دن بعد ایف سی کی جانب سے کچھ جان بحق ہونے والوں کے لواحقین کو دو لاکھ اور زخمیوں کو علاج معالجے کے لیے 50 ہزار روپے فی کس امداد دی گئی۔

فائر بریگیڈ کے دونوں فائٹر کے لواحقین کو ہنوز ملازمت بھی نہیں دی گئی۔ دوسری جانب گزشتہ 9 ماہ سے میونسپل کمیٹی میں فائر بریگیڈ کی فراہمی ہنوز عمل میں نہیں لائی جا سکی۔ نوشکی میں اس سانحہ کے چند روز بعد ڈپٹی کمشنر ہاؤس میں بجلی سرکٹ شارٹ ہونے کی وجہ سے ڈپٹی کمشنر ہاؤس کی تاریخی عمارت جل کر خاکستر ہو گئی اور اس طرح ایک دو آتشزدگی کے واقعات میں بھی آگ پر بروقت قابو نہ پانے کی وجہ سے زیادہ مالی نقصان ہوا۔ گزشتہ دنوں پاکستان کے سب سے بڑے تجارتی شہر کراچی گل پلازہ اور بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ میں بجلی سرکٹ سے مارکیٹ میں آتشزدگی کے واقعات میں جو تباہی، جانی اور مالی نقصان ہوا اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔

اگر خدانخواستہ نوشکی میں جہاں بڑی تعداد میں غیر قانونی منی پیٹرول پمپس اور کئی پیٹرولیم منڈیاں واقع ہیں یا کسی بھی شاپنگ مارکیٹ اور کسی علاقے میں خدانخواستہ اس قسم کا واقع رونما ہوا تو کیا صورت حال ہو سکتی ہے؟ نوشکی کے عوامی نمائندوں صوبائی حکومت ضلعی انتظامیہ اور دیگر اداروں کے نمائندوں کو نوشکی میں فائر اسٹیشن، اور فائر بریگیڈ کے لیے پیشگی اقدامات کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ سانحہ نوشکی میں جاں بحق ہونے والوں کے لواحقین اور زخمیوں کو مالی پیکج کے ساتھ میونسپل کمیٹی کے فائٹر کے لواحقین کو ملازمت بھی دی جائے۔

(محمد سعید)

وادی تیراہ میں نقل مکانی کرنے والے خاندان شدید سردی میں محصور

خیبر وادی تیراہ کے میدانی علاقوں میں گزشتہ دو دنوں سے وقفے وقفے سے جاری شدید برفباری نے معمولاتِ زندگی مفلوج کر دیے ہیں۔ شدید سرد موسم اور مسلسل برفباری کے باعث متاثرینِ نقل مکانی کو شدید مشکلات کا سامنا ہے۔ نقل مکانی کرنے والے خاندانوں کی گاڑیاں باغ مرکز سے دواتوئی چیک پوسٹ تک کئی کلومیٹر طویل قطاروں میں کھڑی ہیں، جہاں بچے، خواتین اور بزرگ کھلے آسمان تلے شدید سردی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ذرائع کے مطابق برفباری کے باعث سڑکیں پھسلن کا شکار ہو چکی ہیں جبکہ کئی مقامات پر راستے مکمل طور پر بند ہو گئے ہیں۔ متاثرین کا کہنا ہے کہ کئی گھنٹوں بلکہ بعض جگہوں پر دن بھر گاڑیاں ایک ہی جگہ کھڑی رہتی ہیں، جس کی وجہ سے ایندھن ختم ہو رہا ہے اور بچوں و بزرگوں میں سردی سے بیماریاں تیزی سے پھیل رہی ہیں۔ شدید سردی کے باعث بچوں کی اموات کی اطلاعات بھی موصول ہوئی ہیں، تاہم سرکاری سطح پر تاحال ان کی تصدیق نہیں کی گئی۔ مقامی افراد کے مطابق شدید ٹھنڈ، خوراک کی کمی اور طبی سہولیات کی عدم دستیابی کے باعث انسانی جانوں کو سنگین خطرات لاحق ہیں۔ متاثرین کا کہنا ہے کہ نہ تو مناسب شیلٹر فراہم کیے گئے ہیں اور نہ ہی ہنگامی طبی امداد یا گرم کپڑوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ متاثرینِ نقل مکانی نے بتایا کہ گھریلو سامان سے بھری گاڑیوں کو برفانی اور ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر لے جانا انتہائی مشکل ہے، جبکہ تنگ اور دشوار گزار پہاڑی راستوں پر پھسلن کے باعث کسی بھی وقت بڑا حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ کئی خاندان خواتین اور بچوں کے ہمراہ سفر کرنے پر مجبور ہیں، جس سے ان کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ متاثرین نے ریاست سے مطالبہ کیا ہے کہ موجودہ خراب موسمی حالات کے پیشِ نظر نقل مکانی کی مدت میں فوری توسیع کی جائے، برفباری رکنے تک نقل مکانی کو عارضی طور پر معطل کیا جائے اور متاثرہ خاندانوں کو محفوظ مقامات پر ٹھہرنے، طبی سہولیات اور بنیادی ضروریات کی فراہمی یقینی بنائی جائے، تاکہ مزید جانی نقصان سے بچا جا سکے۔

(مسعود شاہ)

سول سوسائٹی وکلاء اور صحافیوں کا ایمان مزاری اور ہادی علی چٹھہ سے اظہارِ یکجہتی

حیدرآباد نامور وکیل اور انسانی حقوق کی علمبردار ایمان مزاری اور ان کے شوہر ایڈووکیٹ ہادی علی چٹھہ کو الیکٹرانک کرائمز ایکٹ (پیکا) کے تحت دی گئی سزا کے خلاف ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے زیرِ اہتمام حیدرآباد پریس کلب کے سامنے پُرامن احتجاجی ریلی اور مظاہرہ کیا گیا۔ احتجاج میں ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے نمائندوں، وکلاء برادری، خواتین، صحافیوں اور سول سوسائٹی کے کارکنان نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ احتجاجی مظاہرے میں ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی ریجنل کوآرڈینیٹر غفرانہ آرائیں، مرکزی رہنما امداد چانڈیو، پشپا کماری، سیشن کورٹ اور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشنز کے نمائندگان، ایڈووکیٹ ذوالفقار تھیبو، نواب بڑدی، عاصمہ جہانگیر ٹیم، پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے مرکزی نائب صدر خالد کھوکھر، ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن اقبال ملاح، حیدرآباد یونین آف جرنلسٹس کے سینئر نائب صدر تنویر احمد آرائیں سمیت سینئر صحافیوں رمضان شورو، اعجاز لغاری، نیاز وگھیو، فیصل ڈاھری، راجہ انور اور دیگر نے شرکت کی۔ اس موقع پر احتجاجی شرکاء نے کہا کہ احتجاج کا مقصد ایمان مزاری اور ہادی علی چٹھہ کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کے ساتھ ساتھ پیکا ایکٹ جیسے سیاہ قانون کے تحت صحافیوں، وکلاء، سول سوسائٹی کے نمائندوں اور سوشل میڈیا ایکٹوسٹس کے خلاف قائم مقدمات کے خلاف آواز بلند کرنا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ پیکا ایکٹ آزادی اظہار، آزادی صحافت اور شہریوں کے بنیادی حقوق کو سلب کرنے کا ذریعہ بن چکا ہے۔ شرکاء نے کہا کہ ملک میں غیر اعلانیہ جبر کے ماحول میں سیاہ قوانین کے ذریعے ظلم، جبر اور ناانصافی کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کو دبایا جا رہا ہے جو آئینِ پاکستان اور انسانی حقوق کے عالمی اصولوں کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ پیکا ایکٹ میں انسانی حقوق کے منافی شقوں کو ختم کیا جائے اور ایمان مزاری اور ہادی علی چٹھہ سمیت تمام صحافیوں اور کارکنان کے خلاف قائم مقدمات واپس لیے جائیں۔ شرکاء نے اس عزم کا اظہار کیا کہ جب تک شہری آزادیوں اور آزادی اظہار کا تحفظ یقینی نہیں بنایا جاتا، پرامن اور جمہوری جدوجہد جاری رکھی جائے گی۔ اس موقع پر شرکاء نے سیاہ قانون پیکا ایکٹ، وکلاء، صحافیوں اور انسانی حقوق کارکنان کے خلاف کارروائی، آزادی اظہار پر قدغن نامنظور نامنظور، ایمان مزاری اور ہادی بخش چھٹہ کو رہا کرو، صحافت اور شہری آزادیوں پر حملے بند کیے جائیں کے نعرے بھی لگائے۔

(محمد رمضان شورو)

صاف پانی کی عدم فراہمی

سانگھڑ ضلع سانگھڑ کی تحصیل شہداد پور کے علاقے شاہ پور چاکر میں صاف پانی کی عدم فراہمی پر ملک آباد سمیت دیگر علاقوں کے مکینوں سڑکوں پر نکل آئے۔ مظاہرین نے ٹاؤن کمیٹی پہنچ کر چیئرمین آفس کے سامنے شدید احتجاجی مظاہرہ کرتے ہوئے صاف پانی کی فراہمی کا مطالبہ کیا۔ مظاہرین نے ٹاؤن انتظامیہ کے خلاف زوردار نعرے بازی کی اور ''پانی دو، پانی دو'' کے نعرے لگائے۔ انہوں نے کہا کہ گزشتہ تین برس سے علاقے میں پانی کی فراہمی بند ہے۔ اس حوالے سے متعدد بار متعلقہ انتظامیہ کو درخواستیں دی گئی ہیں لیکن اس مسئلے پر توجہ نہیں دی گئی نہیں۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ ہمارے علاقے میں غریب مزدور لوگ روزانہ دو سو سے چار سو روپے کا پانی خریدنے پر مجبور ہیں۔ اگر فوری طور پر پانی کی فراہمی بحال نہ کی گئی تو لوگ مرکزی شاہراہ کو بند کرنے پر مجبور ہوں گے۔ (ابراہیم خلجی)

10 بھٹہ مزدور بازیاب

عمرکوٹ 9 جنوری کو عمرکوٹ تعلقہ کی پولیس نے سیشن کورٹ عمرکوٹ کے حکم پر عمرکوٹ کے قریب علاقے موٹو مالہی کے پاس نورالدین پٹھان کے اینٹوں کے بھٹے پر چھاپہ مار کر جبری مشقت کے شکار 10 بھٹہ مزدور کو بازیاب کیا۔ بھٹہ مزدروں نے الزام لگاتے ہوئے کہا کہ بھٹہ مالک ان کی محنت کے معاوضے کا حساب کتاب نہیں کرتا تھا اور ان سے زبردستی جبری مشقت کراتا تھا۔ عدالت نے بازیاب ہونے والے تمام بھٹہ مزدوروں کو ان کی مرضی اور پسند کے مطابق آزاد زندگی گذارنے کی اجازت دی۔

(نامہ نگار)

سیاسی اتحاد باڑہ کا متاثرینِ تیراہ کے حق میں بڑا اعلان، امن تحریک شروع کرنے کا فیصلہ

باڑہ۔خیبر سیاسی اتحاد باڑہ نے تیراہ میدان سے نقل مکانی کرنے والے تمام متاثرہ خاندانوں کے ساتھ مکمل یکجہتی کا اعلان کرتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ ماضی کے فوجی آپریشنز، شیلنگ، ڈرون کارروائیوں اور بدامنی کے باعث بے گھر ہونے والے متاثرین کو فوری طور پر باعزت طریقے سے بحال کیا جائے۔ سیاسی اتحاد باڑہ کی جانب سے جاری کردہ اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ متاثرینِ تیراہ گزشتہ کئی برسوں سے بے سروسامانی، عدم تحفظ اور شدید مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں، حالانکہ انہوں نے ہر دور میں ریاست کے ساتھ تعاون، صبر اور قربانی کی مثالیں قائم کیں، مگر اس کے باوجود آج بھی انہیں بنیادی انسانی، آئینی اور قبائلی حقوق سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ اعلامیے میں واضح کیا گیا کہ متاثرینِ تیراہ کا مسئلہ کسی ایک قبیلے یا علاقے تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک اجتماعی اور قومی مسئلہ ہے، جس کے حل میں مزید تاخیر ناقابلِ قبول ہے۔ خیبر قومی جرگہ میں باڑہ سیاسی اتحاد کے صدر ہاشم خان، جنرل سیکرٹری عطاء اللہ، شیریں آفریدی، سابقہ ایم پی اے شفیق آفریدی، اے این پی عبدالرزاق، فاٹا لویہ جرگہ صدر ملک بسم اللہ، جماعت اسلامی کے شاہ فیصل، پی ٹی آئی عابد آفریدی، جماعت اسلامی خان ولی آفریدی، مسلم لیگ ن اصغر آفریدی، ملک محمد حسین سمیت کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

سیاسی اتحاد باڑہ کے اہم مطالبات

وادی تیراہ میں فوری طور پر مکمل امن بحال کیا جائے اور مستقبل میں پائیدار امن کی واضح ضمانت دی جائے۔ تیراہ میں فائرنگ، شیلنگ، گھروں پر مارٹر گولے برسائے جانے اور ہیلی کاپٹر کارروائیوں کو فوری طور پر بند کیا جائے، کیونکہ ان اقدامات سے عام شہریوں میں خوف و ہراس پھیل رہا ہے۔ متاثرینِ تیراہ کی باعزت واپسی کو یقینی بنایا جائے اور ان سے کیے گئے تمام وعدوں اور معاہدوں کو تحریری و عملی طور پر نافذ کیا جائے۔ متاثرین کی رجسٹریشن کے عمل میں سیاسی مداخلت، اقربا پروری، انتظامی نااہلی اور کرپشن کی غیر جانبدار تحقیقات کر کے ذمہ دار عناصر کے خلاف کارروائی کی جائے۔ تیراہ کے بالائی علاقوں میں گھروں کے درست پتے نہ رکھنے والے تمام رہائشیوں کو آئی ڈی پیز کا اسٹیٹس دے کر مکمل رجسٹریشن کی جائے اور امدادی پیکیجز میں شامل کیا جائے۔ پولیٹیکل انتظامیہ یا نادرا کی من پسند اور خودساختہ رجسٹریشن کو سیاسی اتحاد باڑہ کسی صورت قبول نہیں کرتا کیونکہ اس عمل سے حقیقی متاثرین محروم ہو رہے ہیں۔ وادی تیراہ کے بعد اپر باڑہ اور بازو پین ایریا میں بڑھتی ہوئی بدامنی پر شدید تشویش کا اظہار کرتے ہوئے فوری کنٹرول کا مطالبہ کیا گیا۔ قیامِ امن کے لیے سیاسی اتحاد باڑہ نے آج سے باڑہ میں امن تحریک کے آغاز کا اعلان کیا ہے تاکہ عوام کو محفوظ ماحول فراہم کیا جا سکے۔ باڑہ میں اغوا برائے تاوان، دھمکی آمیز کالز اور شہریوں میں خوف و ہراس کے خاتمے کے لیے حکومت اپنی آئینی ذمہ داریاں پوری کرے۔ صوبائی اور وفاقی حکومتوں کی جانب سے متاثرینِ تیراہ کے حوالے سے غیر سنجیدہ بیانات قابل افسوس قرار دیتے ہوئے مطالبہ کیا گیا کہ دونوں حکومتیں مل بیٹھ کر مستقل حل نکالیں۔

احتجاجی تحریک کی وارننگ

اعلامیے میں خبردار کیا گیا کہ اگر سیاسی اتحاد باڑہ کے آئینی، قانونی اور اخلاقی مطالبات پر فوری اور عملی عمل درآمد نہ ہوا تو متاثرینِ تیراہ اور ضلع خیبر کے عوام کے ساتھ مل کر صوبائی اور وفاقی حکومتوں کے خلاف بھرپور احتجاجی تحریک شروع کی جائے گی، جس کی تمام تر ذمہ داری متعلقہ حکام پر عائد ہوگی۔ سیاسی اتحاد باڑہ نے اس عزم کا اعادہ کیا کہ وہ متاثرینِ تیراہ کے ساتھ ہر فورم پر کھڑا رہے گا اور ان کے حقوق کے حصول تک اپنی جدوجہد جاری رکھے گا۔ اعلامیے کے آخر میں کہا گیا کہ مطالبات پورے نہ ہونے کی صورت میں سیاسی اتحاد باڑہ مرکزی حکومت، وزیر اعلیٰ ہاؤس اور دیگر متعلقہ اداروں کے سامنے متاثرین کی 13,744 گاڑیوں کے ہمراہ احتجاجی مارچ کرے گا۔

(جاری کردہ: سیاسی اتحاد باڑہ)

متاثرین کے کیمپ پر زخہ امن تنظیم کے اہلکاروں کا مبینہ طور پر دھاوا

خیبر پینڈی چینہ میں وادی تیراہ کے متاثرین کے لیے قائم کیمپ پر زخہ امن تنظیم کے اہلکاروں نے مبینہ طور پر دھاوا بول دیا اور جہاں متاثرہ خاندانوں کے لیے پڑی اشیائے خورد و نوش متاثرین میں تقسیم کی بجائے خود کھا گئے جبکہ بچی ہوئی اشیاء گھروں کو لے جائی گئیں۔ ذرائع کے مطابق متاثرین میں اکثریت خواتین اور بچوں کی تھی، تاہم اس کے باوجود ان کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ عینی شاہدین کے مطابق صورتحال اس وقت کشیدہ ہوئی جب زخہ امن کمیٹی کے مسلح افراد پینڈی چینہ کیمپ میں داخل ہوئے اور نادرا سمیت دیگر سرکاری آلات کی توڑ پھوڑ کی کوشش کی۔ اہلکاروں نے موقف اختیار کیا کہ اگر ان کا اندراج نہیں کیا گیا تو کسی بھی متاثر خاندان کی رجسٹریشن نہیں ہونے دی جائے گی، جس کے بعد زبردستی کام رکوا دیا گیا۔ باخبر ذرائع نے بتایا کہ انتظامیہ نے انہیں بارہا کہا کہ سڑکوں پر کھڑی گاڑیوں کو پہلے کلیئر کیا جائے گا۔ بعد ازاں قومی شناختی کارڈ میں جن کا پتہ وادی تیراہ ہوگا اس کی رجسٹریشن کی جائے گی۔ کیمپ میں کام کی بندش کے باعث متاثرین کی گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگ گئیں، جن میں خواتین اور بچوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ شدید سردی اور انتظار کے باوجود امن کمیٹی کے اہلکاروں کی جانب سے کسی قسم کا تعاون نہیں کیا گیا۔ دوسری جانب اس واقعے پر وادی تیراہ کی 24 رکنی کمیٹی نے سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ پینڈی چینہ سے رجسٹریشن کیمپ فوری طور پر منتقل کر کے دواتوئی یا ترخوکس اپر باڑہ میں قائم کیا جائے تاکہ متاثرین کو مزید مشکلات سے بچایا جا سکے۔ 24 رکنی کمیٹی نے اعلیٰ حکام سے واقعے کا نوٹس لینے اور ذمہ دار عناصر کے خلاف کارروائی کا بھی مطالبہ کیا ہے۔

(منظور آفریدی)

گرینڈ الائنس کے مطالبات کے حق میں احتجاجی ریلی

نوشکی گرینڈ الائنس کے مطالبات کے حق میں آل پارٹیز اور گرینڈ الائنس کے زیر اہتمام احتجاجی ریلی نکالی گئی۔ میر گل خان نصیر چوک پر احتجاجی مظاہرہ سے بی این پی کے صوبائی کمیٹی کے ممبر میر خورشید جمالدینی، نیشنل پارٹی کے ضلعی صدر فاروق بلوچ، جماعت اسلامی کے ضلعی امیر مولوی محمد قاسم مینگل، گرینڈ الائنس کے رہنما ماسٹر شبیر احمد اور حق نواز شاہ نے خطاب کیا۔ مقررین نے کہا بلوچستان کے ملازمین اپنے حقوق کے لیے گزشتہ 9 ماہ سے جمہوری انداز میں جدوجہد کررہے ہیں لیکن صوبائی حکومت ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے وعدوں سے انحراف کررہی ہے اور معاہدوں کے خلاف ورزی کے مرتکب ہورئی ہے۔ انھوں نے الزام لگایا موجودہ حکومت فارم 47 کی پیداوار ہے جسے عوام اور ملازمین سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ تین صوبوں اور وفاقی ملازمین کو ڈی آر اے دینا اور بلوچستان کے ملازمین کو نظر انداز کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ ملازمین اپنے حقوق کے لیے جمہوری انداز میں جدوجہد کررہے ہیں لیکن حکومت ملازمین کو حقوق دینے کے بجائے غیر جمہوری حربے استعمال کرکے ملازمین کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے مرغوب کرنے کی کوشش کررہی ہے جو قابل مذمت اور باعث تشویش ہے۔ مقررین نے کہا ملازمین ملک کی ترقی اور خوشحالی میں ریڑھی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا ملازمین کے حقوق کے حصول تک ہماری جد وجہد جاری رہے گی۔ مقررین نے کہا بلوچستان کے حقیقی نمائندہ حکومتوں نے اپنے ادوار میں ملازمین کے تنخواہوں میں اضافہ اور دیگر مراعات دی لیکن فارم 47 کے زریعے حکومت بنانے والے نمائندوں کو ملازمین اور عوام کے مفادات سے کوئی سروکار کار نہیں ہے، وہ اپنے آقاؤں کی خوشنودی میں مصروف ہے۔ مقررین نے مطالبہ کیا تمام اسیر ملازمین کو باعزت طور پر رہا کرکے ڈی آر اے کے اجرا کا نوٹیفکیشن جاری کرکے ملازمین میں پائی جانے والی بے چینی کا ازالہ کیا جائے۔ ملازمین کے احتجاج کے باعث بلوچستان میں نظام زندگی بری طرح مفلوج ہوگیا ہے جس عوام مشکلات اور مصائب سے دوچار ہیں۔ بارش اور سخت سردی کے باوجود ملازمین کا احتجاج حکومت کی کارکردگی پر سوالیہ نشان ہے۔ ملازمین نے صوبائی حکومت کے خلاف نعرے بازی بھی کی۔

(محمد سعید)

دکھاوے کے حکمران

گزشتہ کئی سالوں سے حکومتی کارکردگی پر نظر رکھنے والے باشعور شہری برملا اظہار کرتے رہے ہیں کہ ہمارے حکمرانوں کو عوامی نوعیت کے کاموں میں دلچسپی نہیں رہی بلکہ عوامی ردعمل کا خوف بھی نہیں رہا۔ اب تو عام شہری بھی سمجھتے ہیں کہ پہلے اقتدار کا مرکز وفاق تھا مگر اٹھارہویں ترمیم کے بعد اختیارات صوبوں کو منتقل ہوئے مگر صوبوں نے آگے مقامی سطح پر ان اختیارات کو منتقل نہ کیا جس کی وجہ سے آمریت کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

صوبے بلدیاتی اداروں کو اختیارات منتقل کرنا تو دور کی بات بلدیاتی الیکشن کروانا بھی بوجھ سمجھتے ہیں، پنجاب میں 2021 سے بلدیاتی الیکشن زیرالتواء ہیں، متعدد بار الیکشن ایکٹ میں ترمیم کرکے تاخیر کا بہانہ کیا گیا اور یوں صوبائی حکومت اپنے نمائندوں کی من پسند جگہوں پر ان اداروں کا فنڈ استعمال کررہی ہے۔ مورخہ 18 دسمبر کو چیف منسٹر پنجاب بہاولپور اور لودھراں آئیں، انہوں نے ہونہار سکالرشپ اور لیپ ٹاپ سکیم کی تقریب کیلئے لودھراں جانا تھا۔ بہاولپور ائیر پورٹ سے لودھراں شہر تک 20 کلومیٹر کے سفر میں ضلعی انتظامیہ کے اعلیٰ افسران اور میونسپل کارپوریشن، ستھرا پنجاب کے اہلکار جگہ جگہ ٹولیوں میں سڑکوں کی صفائی میں مصروف تھے، کئی ٹرالیوں پر کوڑا اُٹھا رہے تھے، سڑکوں کے ساتھ فٹ پاتھوں کو دھویا جارہا تھا تو کہیں جنگلوں کو رنگ کیا جارہا تھا، سڑک کنارے سفر کرنے والے اور مسافر حیران و پریشان تھے کہ آج انتظامیہ کو کیا ہوگیا ہے کہ سڑکوں کی دھلائی کے ساتھ گڑھوں کو پر کیا جارہا ہے، ایسے تو بادشاہوں کی آمد پر بھی نہیں ہوتا تھا۔ راقم کو ایک شخص نے بتایا کہ ہونہار سکالرشپ اور لیپ ٹاپ کی سکیم پہلی بار لانچ نہیں ہورہی کہ اس کیلئے اتنے انتظامات کیے جائیں اور لاہور سے بہاولپور اور لودھراں تقریب منعقد کرکے عوام کے پیسے کو ضائع کیا جائے۔

ایک اور شہری نے بتایا کہ یہ صفائی صرف ایک دن ہی کیوں وہ بھی ان کی آمد پر، اس کا مطلب ہوا کہ صفائی شہریوں کیلئے نہیں بلکہ ہمارے حکمران حکمرانی کے لائق نہیں رہے۔ انہوں نے ہمارے وسائل اور اختیارات پر قبضہ کرلیا ہے، جب چاہتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں خرچ کرتے ہیں۔ ایک طالب علم نے بتایا کہ ٹریفک قوانین کی پابندی بہت ضروری ہے مگر حکمرانوں نے سیف سٹی کے نام پر ہر شہری پر کیمرا لگادیا ہے جس سے ہم خوف زدہ ہیں، بھاری جرمانے عائد کردیے ہیں، اصلاح کی بجائے ہمیں تشدد پر اکسایا جارہا ہے۔ دوسرے طالب علم نے بتایا کہ جب ہم کینٹ کے علاقے میں جاتے ہیں تو شناختی کارڈ کے ساتھ ساتھ گاڑی کے مکمل کاغذات ساتھ رکھتے ہیں، اب اس پنجاب کو کینٹ بنادیا گیا کہ سڑکوں کے پاس دکانیں ناجائز تجاوزات کے نام پر گرائیں جارہیں، بازاروں میں روزی کمانے والوں کو بھگایا جارہا ہے۔

نئی نئی اتھارٹیاں، کمپنیاں اور عہدے بنادیے ہیں، جو کام عوامی منتخب بلدیاتی چیئرمینوں کے تھے وہ اختیارات ان کے سپرد کردیے ہیں۔ نئے نئے ایکٹ بنا کر ان افسران کو آقا بنایا جارہا ہے اور ہم شہری خود کو عام تصور کرنے لگے ہیں۔

ایک اور سیاسی کارکن نے بتایا کہ مختلف انتظامی عہدوں کے افسران بالا کو عوامی جان و مال کی حفاظت کی بجائے دیگر غیر ضروری کاموں میں لگایا جارہا ہے، شہر کے مصروف چوکوں پر پنجاب پولیس، ٹریفک پولیس، ڈالفن فورس، ایلیٹ فورس کے جوان بڑی بڑی گاڑیوں کے ساتھ چیکنگ میں ایسے مصروف ہوتے ہیں جیسے دہشت گردوں کو تلاش کررہے ہوں۔ کار، موٹر بائیک، چنگچی چلانے والوں کو ہراساں کیا جاتا ہے اور بھاری جرمانہ عائد کیا جاتا ہے کہ ایک ڈرائیور کے پاس 10 ہزار روپے ہوں تو وہ گھر سے باہر نکلے، غریب کی روٹی تو 78 سال سے پوری نہیں ہورہی اور آئندہ بھی رونا دھونا جاری رہے گا۔

راقم کے لیے حیران کن بات تھی کہ چیف منسٹر کی آمد پر مقامی کارکنوں اور نمائندوں کی طرف سے ایک بھی خیر مقدمی بینر نظر نہیں آیا مگر ضلعی انتظامیہ اور اس کے اداروں کی طرف سے پنجاب میں جاری سکیموں کے درجنوں بڑے بڑے پینافلکس نظر آئے جو حکومتی فنڈز کے بے جا استعمال کا پتہ دیتے ہیں۔

مختلف ضلعوں سے تعلیمی اداروں کی بسوں کے زریعے سینکڑوں طالب علموں، خصوصاً طالبات کو لایا گیا۔ ہمارا نظام حکومت کارپوریٹ طرز پر چلایا جارہا ہے جس میں عوامی راج دکھائی ہی نہیں دیتا۔ ان سیاسی جماعتوں میں ایک ہی خاندان کی اجارہ داری ہے، اسمبلی کی کاروائیاں محض رسمی ہیں، منتخب نمائندے محض نمائشی ہیں۔ جب تک مقامی حکومتیں بااختیار نہیں ہوں گی تب تک مسائل جوں کے توں رہیں گے، بلکہ ان میں اضافہ ہوگا۔

(خواجہ اسداللہ)

مین ہول میں گرنے سے ماں بیٹی جاں بحق

لاہور بھاٹی گیٹ داتا دربار کے قریب کھلے مین ہول میں ماں بیٹی کے گرنے کا دل خراش واقعہ پیش آیا جس نے پورے شہر کو ہلا کر رکھ دیا، ماں کی لاش کے بعد 18 گھنٹے بعد بچی کی لاش بھی مل گئی۔ ایکسپریس نیوز کے مطابق واقعہ بدھ کی رات پیش آیا تھا جس کے بعد پہلے ماں کی لاش ملی اور آج بچی کی لاش بھی برآمد کر لی گئی۔ حادثے کے فوری بعد وزیر اطلاعات پنجاب عظمیٰ بخاری نے ماں اور بیٹی کے کھلے مین ہول میں گرنے کے واقعے کو جھوٹ قرار دے تھا۔ اپنے بیان میں انہوں نے کہا کہ لاہور میں ریسکیو 1122 کے جوانوں نے ایک بار پھر اپنی مستعدی کی مثال قائم کی اور بروقت اقدامات کیے جس میں یہ بات سامنے آئی کہ ماں اور بیٹی کے ڈوبنے کی اطلاع "فیک" ہے۔ دوسری جانب ڈی آئی جی آپریشنز لاہور محمد فیصل کامران نے حادثے کی تصدیق کی اور بتایا کہ جاں بحق خاتون کی شناخت سعدیہ کے نام سے ہوئی جس کی لاش نکال لی گئی، 1122 کو واقعے کی کال موصول ہوتے ہی فوری طور پر تمام اداروں کو متحرک کیا گیا، خاتون کی ڈیڈ باڈی آؤٹ فال روڈ ڈسپوزل سے ملی۔ ڈی آئی جی کے مطابق پورے معاملے کی باریک بینی سے تحقیقات کی گئیں، سیف سٹی کیمروں کی مدد سے پورے واقعے کو مانیٹر کیا گیا، سی سی ٹی وی فوٹیج سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ خاتون کے شوہر کی بیان کردہ تمام باتیں درست تھیں، فیملی رکشا پر آئی، کہاں رکشا پارک کیا، کس راستے سے داتا دربار زیارت کے لیے گئے اور واپسی پر کیسے یہ افسوس ناک حادثہ پیش آیا سب کچھ کیمروں میں محفوظ ہے۔ ڈی آئی آپریشنز فیصل کامران نے بتایا کہ یہ خاندان داتا دربار پر سلام پیش کر کے نکل رہا تھا کہ اچانک کھلے مین ہول میں گرنے کا حادثہ پیش آیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ خاتون کا شوہر حراست میں نہیں تھا بلکہ واقعے سے متعلق معلومات حاصل کی جا رہی تھیں۔ (نامہ نگار)

عورت کی پھندا لگی لاش برآمد

سانگھڑ 8 جنوری 2026 کو سانگھڑ منگلی پولیس تھانے کی حدود میں گھر سے عورت کی پھندا لگی لاش برآمد ہوئی۔ خاتون کی شناخت عربی زوجہ لیاقت کے نام سے ہوئی ہے۔ خاتون کے والد کا بیان تھا کہ اس کی بیٹی کو اس کے شوہر لیاقت اس کے ساتھیوں نے تشدد کر کے قتل کیا اور بعد میں خودکشی کا ڈرامہ رچایا۔ خاتون کی لاش کو تحویل میں لیکر ڈی ایچ کیو منتقل کر دیا گیا ہے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ آنے کے بعد ہی اصل شواہد سامنے آئیں گے۔
(ابراہیم خلجی)

تولیدی صحت میں بہتری لیکن غربت اور سماجی رویے اب بھی رکاوٹیں

---- پاکستان میں دوران زچگی طبی خدمات اور خاندانی منصوبہ بندی تک رسائی میں بہتری آئی ہے، تاہم خواتین کی بڑی تعداد اب بھی تعلیم کی کمی، غربت، تشدد اور صحت کے نظام میں خامیوں کے باعث اپنے بنیادی تولیدی حقوق سے محروم ہے۔ اقوام متحدہ کے فنڈ برائے آبادی (یو این ایف پی اے) کی جانب سے پاکستان میں تولیدی خودمختاری سے متعلق نئی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ خواتین کی شادی کی اوسط عمر میں گزشتہ تین دہائیوں کے دوران بتدریج اضافہ ہوا ہے۔ سال 91-1990 میں خواتین کی پہلی شادی کی اوسط عمر 18.6 سال تھی جو 18-2017 میں بڑھ کر 20.4 سال ہوگئی۔ اس پیش رفت کے باوجود یہ عمر عالمی سطح پر تجویز کردہ کم از کم 21 سال کی عمر سے کم ہے۔ اس حوالے سے پاکستان کے دیہی اور شہری علاقوں کے درمیان واضح فرق بھی برقرار ہے۔ شہری خواتین دیہی خواتین کے مقابلے میں تاخیر سے شادی کرتی ہیں۔ اس کی بڑی وجوہات میں تعلیم، قانون کے نفاذ اور سماجی روایات کا فرق ہیں۔ اس رپورٹ میں پاکستان کی آبادی اور صحت سے متعلق تحقیق (پی ڈی ایچ ایس) کے نتائج اور عالمی تقاضوں کی روشنی میں ملک میں تولیدی خودمختاری کی صورتحال کا جامع جائزہ لیا گیا ہے۔

تعلیم، تحفظ اور خودمختاری

رپورٹ کے مطابق تولیدی خودمختاری کا مطلب یہ ہے کہ خواتین اور مرد کسی جبر، تشدد یا امتیاز کے بغیر شادی، بچے پیدا کرنے اور مانع حمل کے طریقوں کے بارے میں آگاہی پر مبنی اور آزادانہ فیصلے کر سکیں۔ تاہم پاکستان میں جسمانی تحفظ، صحت کی سہولیات تک رسائی اور گھریلو فیصلہ سازی جیسے بنیادی پہلوؤں کے حوالے سے عدم مساوات اب بھی موجود ہے۔ رپورٹ میں تعلیم کو خواتین کے تحفظ اور خودمختاری کا سب سے طاقتور ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کی شادی کی اوسط عمر تقریباً 25 سال ہے جبکہ ناخواندہ خواتین کی شادی اوسطاً 18 سے 19 سال کی عمر میں ہو جاتی ہے۔ اسی طرح، معاشی حالات بھی کم عمری کی شادی کے خطرے کو بڑھاتے ہیں۔ غریب گھرانوں سے تعلق رکھنے والی خواتین کو امیر گھرانوں کے مقابلے میں کہیں پہلے شادی کرنا پڑتی ہے۔

تشدد اور تولیدی اختیار

رپورٹ میں تشدد کو تولیدی خودمختاری کی راہ میں سنگین رکاوٹ قرار دیا گیا ہے۔ 18-2017 کے اعداد و شمار کی رو سے تقریباً 24 فیصد شادی شدہ خواتین نے شوہروں کی جانب سے جسمانی یا جنسی تشدد کا سامنا کیا۔ یہ شرح غریب گھرانوں میں نمایاں طور پر زیادہ پائی گئی جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ معاشی عدم مساوات خواتین کو تشدد کے خطرے سے دوچار کرتی ہے۔ رپورٹ میں خاندانی منصوبہ بندی کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ پاکستان میں مانع حمل طریقوں کے بارے میں آگاہی پر مبنی انتخاب کی صورتحال تشویشناک ہے۔ 18-2017 میں صرف 19 فیصد خواتین کو مانع حمل طریقوں کے مضر اثرات، ان سے نمٹنے کے طریقوں اور متبادل کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کی گئیں۔ یہ شرح گزشتہ برسوں کے مقابلے میں کم ہوئی ہے جو صحت کے نظام میں مشاورت اور تربیت کی کمی کو ظاہر کرتی ہے۔ خاص طور پر دیہی علاقوں میں خواتین عام طور پر شوہر یا سسرال کے دباؤ میں فیصلے کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ رپورٹ کے مطابق، مانع حمل طریقوں کے استعمال میں مجموعی طور پر اضافہ ہوا ہے، تاہم جدید طریقوں کا استعمال تقریباً 25 فیصد تک ہی محدود ہے۔ غریب، کم تعلیم یافتہ اور دیہی خواتین جدید مانع حمل سہولیات سے بہت کم فائدہ اٹھا رہی ہیں۔

جنسی معاملات میں عدم اختیار

اس رپورٹ میں فیصلہ سازی کے حوالے سے انکشاف کیا گیا ہے کہ صرف 31 فیصد خواتین ہی جنسی تعلقات، مانع حمل طریقوں کے استعمال اور صحت کی دیکھ بھال کے بارے میں مکمل خودمختار فیصلے کر پاتی ہیں۔ گھریلو سطح پر بھی خواتین کا کردار محدود ہے۔ صرف 10 فیصد خواتین اپنی صحت سے متعلق فیصلے خود کرتی ہیں جبکہ اکثریت میں یہ فیصلے شوہر کرتے ہیں یا مشترکہ طور پر لیے جاتے ہیں۔

رپورٹ کے مطابق، مشترکہ فیصلہ سازی بظاہر مثبت نظر آتی ہے لیکن اکثر صورتوں میں اس کے پیچھے گھریلو خودمختاری کا عدم توازن موجود ہوتا ہے۔ یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ پاکستان آبادی کے لحاظ سے دنیا کے تیزی سے بڑھتے ہوئے ممالک میں شامل ہے، جہاں آبادی کا بڑا حصہ نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ یہ صورتحال معاشی مواقع پیدا کر سکتی ہے لیکن بلند شرح پیدائش، محدود تولیدی خودمختاری اور تعلیم و روزگار کے ناکافی مواقع اس ممکنہ فائدے کو خطرے میں بدل سکتے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ حکومت کو خواتین کی تعلیم، معاشی بااختیاری، قانونی اصلاحات اور صحت کے نظام میں معیار اور مساوات کو یقینی بنانا ہوگا۔ حقیقی تولیدی خودمختاری نہ صرف ایک بنیادی انسانی حق ہے بلکہ صحت مند خاندانوں، مستحکم معیشت اور پائیدار ترقی کے لیے بھی ناگزیر ہے۔
(بشکریہ یو این خبرنامہ)

ایچ آر سی پی شکایات سیل

ایچ آر سی پی شکایات سیل نے 1985ء میں کام شروع کیا جب کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے میں ایسا مخصوص سیل موجود نہیں تھا جو مظلوم لوگوں کی شکایات وصول کرتا ہو۔ اس وقت سے، ایچ آر سی پی پاکستان بھر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے ازالے کے لئے جدوجہد میں مصروف ہے۔

ایچ آر سی پی شکایت سیل کو ماہانہ سینکڑوں شکایات موصول ہوتی ہیں۔ ہم جو نہی خواتین کے خلاف تشدد، محکمہ جاتی مسائل، اقلیتوں کے حقوق، جبری شادیوں، جبری تبدیلی مذہب، جبری گمشدگیوں، سائبر جرائم اور دیگر تمام انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق شکایات وصول کرتے ہیں اور اس پر ایکشن لیتے ہیں۔ تاہم، مالی معاونت، سیاسی پناہ، جائیداد کے تنازعات یا ذاتی تنازعات سے متعلق شکایات ہمارے دائرہ کار سے باہر ہیں۔

طریقہ کار

جیسے ہی ہمیں شکایات موصول ہوتی ہیں ہم متعلقہ حکام سے رابطہ کرتے ہیں اور کیس پر کارروائی کا آغاز کر دیتے ہیں۔ ہمارا بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے ساتھ ایک براہ راست ریفرل نظام موجود ہے جس کا مقصد شکایت کے فوری ازالے کو یقینی بنانا ہے۔

ہم سے رابطہ کریں

اگر آپ نے کوئی شکایت درج کرانی ہے تو ہمیں کال کر سکتے ہیں، واٹس ایپ کر سکتے ہیں، ای میل بھیج سکتے ہیں یا خط ارسال کر سکتے ہیں۔
آپ اپنے قریبی ایچ آر سی پی شکایات ڈیسک میں بذات خود جا کر شکایت رجسٹر کروا سکتے ہیں اور کمپلینٹ آفیسر سے بذات خود بات کر سکتے ہیں۔

لاہور

ایوان جمہور۔ 107 ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600
فون : +92 42 3586 4994, 3583 8341, 3586 5969
ای۔میل : hrcp@hrcp-web.org
ویب سائیٹ : www.hrcp-web.org
مرکز شکایات سیل
فون : +92 042 3584 5969
موبائل : + 92 0333 200 6800
ای میل: complaints@hrcp-web.org

کراچی

یونٹ نمبر 08، فلور 1
سٹیٹ لائف بلڈنگ نمبر 5 (الاکو ہاؤس)
عبداللہ ہارون روڈ
صدر، کراچی۔ 74400
فون : +92 21 3563 7131, 3563 7132
شکایات سیل (موبائل) : +92 315 111 6287
ای میل : karachi@hrcp-web.org

پشاور

43، گلشن اقبال لین
(نزد ارباب روڈ سٹاپ)
یونیورسٹی روڈ، پشاور
فون : +92 091 584 4253
شکایات سیل (موبائل) : +92 0318 950 0640
ای میل : peshawar@hrcp-web.org

اسلام آباد

آفس B-1، فلور 2
بلاک ڈی-12، (اوپر فیصل بینک)
جی 8، مرکز، اسلام آباد
فون : +92 51 835 1127
شکایات سیل (موبائل) : +92 333 569 4773
ای میل : islamabad@hrcp-web.org

کوئٹہ

فلیٹ نمبر C-6
کبیر بلڈنگ
ایم۔اے جناح روڈ، کوئٹہ
فون : +92 81 282 7869
شکایات سیل (موبائل) +92 306 294 6125
ای میل : quetta@hrcp-web.org

حیدرآباد

306- فائزہ آرکیڈ، (لوفٹ اینڈ میزانائن فلور)
نزد مسجد حاجی شاہ بخاری درگاہ
صدر کنٹونمنٹ، حیدرآباد
فون : +92 22 278 3688, 720 770
فیکس : +92 22 278 4645
شکایات سیل (موبائل) : +92 310 339 2222
ای میل : hyderabad@hrcp-web.org

ملتان

2511/5A ابدالی کالونی
نزد بریٹین سکول
ملتان
فون : +92 61 451 7217
شکایات سیل (موبائل) : +92 331 665 5529
ای میل : multan@hrcp-web.org

گلگت

آفس نمبر 8-9، رانگ ئیل پلازہ
جماعت خانہ روڈ، ذوالفقار آباد کالونی،
جتیال، گلگت
موبائل : +92 0344 547 5553
شکایات سیل (موبائل) : +92 355 454 1088
ای میل : gilgit@hrcp-web.org

تربت/مکران

پرواز ہاؤس،
بالمقابل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
پسنی روڈ، تربت، کیچ
فون : +92 852 413 365
شکایات سیل (موبائل) : +92 323 234 2406
ای میل : turbat@hrcp-web.org

Human Rights Commission of Pakistan
جہدِ حق
پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق جہدِ حق کے تمام قارئین کو آگاہ کرنا چاہتا ہے کہ
یہ رسالہ مفت ہے۔ قارئین کو کسی قسم کی قیمت ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے

انسانی حقوق کا عالمی منشور

10 دسمبر 1948ء کو اقوام عالم نے انسانی حقوق کا مندرجہ ذیل عالمی منشور منظور کیا

دفعہ - 1: تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ -2: ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں اور اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قومیت، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اس کے علاوہ کسی بھی شخص کے ساتھ اس کے علاقے یا ملک کی، سیاسی، عملی یا بین الاقوامی حیثیت کی بناء پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا اقدار اعلی کے لحاظ سے کسی اور بندش کا پابند ہو۔

دفعہ - 3: ہر شخص کو اپنی آزادی، زندگی اور تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 4: کوئی شخص، غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جا سکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی بھی شکل ہو، ممنوع ہوگی۔

دفعہ - 5: کسی شخص کو جسمانی اذیت، یا ظالمانہ انسانیت سوز، یا ذلت آمیز سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ - 6: ہر شخص کا حق ہے کہ ہر جگہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔

دفعہ - 7: قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حق دار ہیں۔ اس اعلان کی خلاف ورزی میں جو بھی تفریق کی جائے یا جس تفریق کی بھی ترغیب دی جائے، اس سے بچاؤ کے سب برابر کے حقدار ہیں۔

دفعہ - 8: ہر شخص کو ان فعال کے خلاف جو دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کی نفی کرتے ہوں، با اختیار قومی عدالتوں سے موثر طریقے سے چارہ جوئی کرنے کا حق ہے۔

دفعہ - 9: کسی شخص کو من مانے طور پر گرفتار، نظر بند، یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 10: ہر شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق و فرائض کے تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے فیصلے کے بارے میں اسے ایک آزاد اور غیر جانب دار عدالت میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا موقع ملے۔

دفعہ - 11: (1) ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری الزام عاید کیا جائے، اس وقت تک بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے جب تک کہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع اور تمام ضمانتیں نہ دی جا سکی ہوں۔

(2) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگزاشت کی بناء پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی اسے کوئی ایسی سزا دی جائے گی جو جرم کے ارتکاب کے وقت کی مقرر کردہ سزا سے زائد ہو۔

دفعہ - 12: کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار، خط و کتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کو ایسے حملے یا مداخلت سے قانونی تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 13: (1) ہر شخص کو اپنی ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت کرنے اور کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی طرح اسے اپنے ملک میں واپس آ جانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ - 14: (1) ہر شخص کو عقیدے کی بنا پر ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(2) یہ حق ان عدالتی کاروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں کیا جا سکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف ہیں۔

دفعہ - 15: (1) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

(2) کوئی شخص محض من مانے طور پر قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کو اپنی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار کیا جائے گا۔

دفعہ - 16: (1) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت، یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازدواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

(2) نکاح فریقین کی پوری آزادی اور رضامندی سے ہوگا۔

(3) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حقدار ہے۔

دفعہ - 17: (1) ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 18: ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے اور اجتماعی یا انفرادی طور پر خاموشی یا کھلے بندوں اپنے عقیدے کی تبلیغ، اس پر عمل، اور اس کی عبادات اور رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ - 19: ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اور بلا کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہے اور جس ذریعے سے چاہے اور ملکی سرحدوں کے حائل ہوئے بغیر معلومات اور خیالات کا حصول اور ان کی ترسیل کرے۔

دفعہ - 20: (1) ہر شخص کو پرامن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ - 21: (1) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔

(3) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوں گے اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مماثل کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ - 22: معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو عملاً حاصل کرے، جو اس کی عزت اور شخصیت کی آزادانہ نشوونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ - 23: (1) ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب و معقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔

(3) ہر شخص جو کام کرتا ہے وہ ایسے مناسب و معقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل و عیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جا سکے۔

(4) ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں، (ٹریڈ یونین) قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ - 24: ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے ساتھ مقررہ وقفوں پر تعطیلات میں شامل ہیں۔

دفعہ - 25: (1) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات، اور بیروزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا اور ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق شامل ہے۔

(2) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی کے بغیر پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بعد، معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ - 26: (1) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں مفت ہوگی۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشوونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

(3) والدین کو اس بات کے تصفیہ کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

دفعہ - 27: (1) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، فنون لطیفہ سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

(2) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفادات کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، فنی یا ادبی تصنیف سے، جس کا وہ مصنف ہے، حاصل ہوتے ہیں۔

دفعہ - 28: ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام کا حقدار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہو سکیں جو اس اعلان میں شامل ہیں۔

دفعہ - 29: (1) ہر شخص پر معاشرے کے حق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشوونما ممکن ہے۔

(2) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے اور ایک جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔

(3) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔

دفعہ - 30: اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جا سکتی جس سے کسی ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی نفی ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
"ایوان جمہور" 107۔ ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
فون: 35864994-35838341 فیکس: 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ: www.hrcp-web.org
پرنٹر: مکتبہ جدید پریس، 14 ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15
کمپوز: جمال احمد سید رضا شاہ